

نمبر ۴۳

عربوں کا فنِ تعمیر

از

شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی بیرسٹرایٹ لا

ماخوذ

از کتاب تمدنِ عرب

۱۹۱۰ء

مطبوعہ رفاہِ عام سٹیم پریس لاہور

باراول — باہتمام مولوی عبدالحق صاحب مالک و منیجر — تعداد جلد (۱۰۰۰)

Bilgrāmī, Sayyid ʻAlī

ʻArabon kā fann-i taʻmīr

مثل قصور صیفرہ اور قوبع کے جو جزیرہ صقلیہ میں ہیں اور مسجد حسن کے جو قاہرہ میں ہے اور نیز دوسری عمارات میں پتھر کا استعمال کیا۔ اُنہوں نے اکثر اور علی الخصوص اندلس میں ایک قسم کے مرکب مصالح سے کام لیا۔ جس میں چونا۔ ریتی۔ مٹی اور چھوٹے چھوٹے پتھر ملے ہوئے تھے اور جو ترکیب پانے کے بعد مثل ترشے ہوئے پتھر کے مضبوط ہو جاتا تھا۔

کہا گیا ہے کہ عربوں کی عمارتوں میں استحکام نہیں ہے۔ بعض کی نسبت یہ قول البتہ درست ہے لیکن سب عمارتوں پر صادق نہیں آتا۔ جب عرب کسی عمارت کو جلد بنانا چاہتے تھے اور انہیں محض ظاہری صورت ملحوظ ہوتی تھی تو ان کے مکانات بھی ویسے ہی کمزور ہوتے تھے۔ جیسی ہماری آج کل کی عمارتیں ہیں۔ لیکن ان کا ایسی عمارتوں کو چھوڑ جانا جن پر اس وقت ہزار سال سے زیادہ گذر گئے ہیں ثابت کرتا ہے کہ جب اُنہیں استحکام منظور ہوتا تو وہ بہت پائدار عمارتیں بنانے کی قابلیت رکھتے تھے۔ صقلیہ کے سادے قصر جن پر آٹھ صدیاں گذر گئی ہیں ہر قسم کی بدسلوکیاں جھیل چکے ہیں۔ الحمرا بھی باوجود اپنی نزاکت کے اس وقت تک قایم ہے۔

ستون اور ان کے پرکالے اُن کُل ملکوں میں جہاں عرب پہنچے اُنہوں نے بہت سی عمارتیں یونانی۔ رومی۔ شرقی، ویران اور متروک حالت میں پائیں اور اُنہوں نے ان کے ستون اور راس العمود یعنی

پر کالوں کو اپنی عمارتوں میں لگایا۔ اسی وجہ سے اُن کی ابتدائی یادگاروں
میں بہت سے ستون مختلف اقسام کے نظر آتے ہیں۔ جب یہ خرچ
ہو گئے تو انہیں ضرور پڑا کہ وہ خود ستون بنائیں اور ان کے پاس اپنی
صنعت کی وہ خاص مُہر تھی جسے وہ ہر چیز پر لگا دیتے تھے۔ قصر الحمرا
کے بیت الاسود کے ستون جیسا کہ موسیو بران تڑی لکھتے ہیں کسی پُرانی
طرز کے نہیں ہیں۔ ان کو خاص عربوں کی ایجاد کہنا چاہیئے۔

محرابیں | نکیلی اور پھیلی ہوئی محرابیں پرانی تعمیر عرب کی خصوصیات میں
سے ہیں۔ میں نے ان پُرانی عمارتوں میں بھی جو یورپ ایشیا اور افریقیہ
میں میری نظر سے گذری ہیں نکیلی اور سادی دونوں قسم کی محرابیں دیکھی
ہیں۔ محراب کی چوٹی اور اُس کے نیچے کا جوڑ جو آخر میں نکیلے ہو گئے ہیں
پرانی عمارتوں میں اس قدر نکیلے نہیں ہیں اگرچہ ان کا نکیلا پن بغور معلوم
ہوتا ہے لیکن ہے بے شک۔ اور اس کی وجہ سے قوس میں ایک
حسن پیدا ہو گیا ہے۔ مصر میں چوٹی بتدریج نکیلی ہوتی گئی۔ اگرچہ قوس
کے نیچے کے حصہ کی مروڑ زیادہ صاف نہیں ہے لیکن اندلس اور افریقیہ
میں یہ مروڑ بڑھتی گئی ہے۔ یہاں تک کہ قوس کی وہ خاص صورت
پیدا ہو گئی ہے جسے نعل اسپی یا پھیلی ہوئی قوس کہتے ہیں اور جو ان دو ملکوں
کی ایک خاص زمانہ کی کل عربی عمارتوں میں پائی جاتی ہے۔

بعض محققین کا قول ہے کہ یہ پھیلی ہوئی قوس شرقیوں میں بھی مروج
تھی لیکن ان کی کوئی مثال نہیں بتائی گئی ہے کیونکہ اس زمانہ کی اکثر عمارتوں میں

اس قسم کی قوس نہیں پائی جاتی تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ اگرچہ اس کا استعمال
کم تھا مگر یہ تھی ضرور۔ میں نے اتھینس کے کپنی کاریا کے گرجے میں
جس کے ایک ستون کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے سلطان
یوڈاکسی نے ۱۰۴۸ء میں بنایا تھا اس قسم کی محرابیں دیکھی ہیں جن کی
قوسوں میں خفیف سا پھیلاؤ ہے۔ لیکن اس کی مڑو نیچے کی طرف اس قدر
کم ہے کہ بغور دیکھنے سے محسوس ہوتی ہے۔

مینار مینار جو ہر مسجد پر ہوا کرتے ہیں ان کی ضرورت یہ ہے
کہ احکام مذہبی کی رو سے موذن ان پر چڑھ کر اذان دیتا ہے۔ ان
کی شکل بہ لحاظ مختلف ممالک کے مختلف رہی ہے اور ہر ملک
میں ایک خاص وضع ہے۔ ایران میں یہ مخروطی ہیں۔ اندلس اور
افریقیہ میں مربع۔ روم میں گول اور اوپر سے مخروطی۔ مصر میں ہر ایک
منزل مختلف صورت کی ہے۔ مصر کے اکثر مینار علی الخصوص مسجد
قائیت بائی کے فی الواقع عجائبات سے ہیں اور کسی چیز سے
عربوں کی ذکاوت اور صناعی اس قدر نہیں معلوم ہوتی جیسی اُن
مختلف رنگ ڈھنگ کی میناروں سے۔ جس وقت ہم اُن کی
میناروں کو ترکوں کی میناروں سے مقابلہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ
ان دو اقوام کی فطرت صناعی میں کس درجہ فرق ہے۔

مثل اکثر عمارات عرب کی میناروں کے اوپر بھی مختلف شکل
کے دندانے بنے ہوئے ہیں دس برگی۔ نیزہ نما۔ تیر نما۔

آری کے دانتوں کی صورت وغیرہ) یہ دندانے ساسانیوں کے
وقت سے ایران میں مروج تھے لیکن ان کی صورتیں اتنی
مختلف نہ تھیں

گنبد اگرچہ گنبد کا لفظ زبان فرانسیسی میں عربی سے مشتق
ہے لیکن گنبد عربوں کی ایجاد نہیں ہے۔ ان سے بہت پہلے گنبد
کا استعمال ملوک ساسانیہ کی عمارتوں اور شرقی قصروں میں ہوا کرتا تھا۔
لیکن اس میں جو خاص بات عربوں نے پیدا کی ہے وہ ان گنبدوں کا
اوپر سے پتلا اور نیچے سے دبا ہونا ہے۔ اگر کسی گنبد کو بیچوں بیچ
سے تراشیں تو اس قوس کی صورت بالکل ان کی محرابوں کی سی ہوگی
اسی قوس میں مبالغہ کرنے کے بعد ایرانیوں نے گنبد کی وہ شلجم نما شکل پیدا کی
ہے جس کا اب ہم ذکر کرینگے۔

عربوں کے گنبدوں کی شکل بلحاظ اختلاف ملک کے مختلف ہے
افریقیہ میں اور علی الخصوص قیروان میں یہ مثل شرقی گنبدوں کے دبے
ہوئے اور ایک ہی مسجد میں متعدد ہیں۔ مصر میں یہ اس شکل کے ہیں
جس کا بیان اوپر ہوا اور کبھی مساجد پر نہیں ہوتے بلکہ اُن دالانوں پر جو
مساجد سے ملحق ہیں اور جن میں قبریں ہوا کرتی ہیں۔ مصر میں
جب کسی مسجد پر گنبد نظر آئے تو سمجھنا چاہئے کہ اس میں
کوئی قبر ہے۔

شام کے گنبد شکل میں مصر کے گنبدوں کے مماثل ہیں۔ علی الخصوص

مسجد حضرت عمرؓ کے گنبد جن کے نیچے کی طرف بہت ہی خفیف سی مروڑ ہے۔ یہ شام کے گنبد اس قدر لمبے نہیں ہیں بلکہ بدہیئت اور ہر قسم کی آرائش سے خالی ہیں۔

مصر میں علی الخصوص اس قبرستان میں جو قاہرہ کے قلعہ کے نیچے واقع ہوا ہے اور جسے ہم نے مقابر خلفا سے تمیز کرنے کی غرض سے میدان مقابر کا نام دیا ہے۔ ہر قسم کے گنبد نظر آتے ہیں۔ کروی بیضاوی۔ مدوّر۔ مخروطی۔ نکیلے۔ قاش دار وغیرہ۔

آرائشی طاقچے عربوں کو ظاہرا خالی سطحوں اور کونوں اور مستطیل شکلوں سے جو یونانیوں کو اس قدر مرغوب تھیں نفرت کلی تھی۔ دیواروں کے گوشوں اور زاویہ قائمہ کو خالی نہ رکھنے کی غرض سے اور مربع حجروں اور گول چھتوں کی درمیانی جگہ کو بھر دینے کی غرض سے وہ ابھرے ہوئے طاق بنایا کرتے تھے جن کی صورت مثلث کروی کی سی ہوتی تھی۔ ان طاقوں کا نام اصطلاح میں آویزہ رکھا گیا ہے کیونکہ یہ گویا خالی جگہ پر آویزاں ہیں۔ چونکہ یہ طاق باقاعدہ اور یکساں بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے اندر بتدریج آرائشیں بڑھائی گئیں جن کی اخیر صورت وہ ہوگئی جو قلمی آرائش کے نام سے مشہور ہے اور جو شکل میں شہد کی مکھی کے چھتے سے مشابہ ہے۔ ان طاقوں کا استعمال جزیرہ صقلیہ میں دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں پایا جاتا ہے۔ اندلس کے عربوں نے ان کروی طاقوں کی صورت بدل کر انہیں منشوری بنایا اور ان کے

اضلاع مقعر کر دیئے۔

طاقوں میں قلمی آرائشوں کا استعمال کرنا خاص عربوں کی طرز ہے اور اس وقت تک کسی اور قوم کی تعمیر میں یہ ایجاد نہیں پائی گئی۔ بارھویں صدی عیسوی کے بعد سے یہ طرز آرائش کل اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ یہ آرائش میناروں کے کٹہروں کے نیچے جہاں ان کے اور دیواروں کے تقاطع سے قائمہ زاویہ بنتے تھے بنائی جاتی تھی۔ مساجد کی محرابی چھتوں میں ان مقامات پر جہاں یہ چھتیں دیواروں سے ملتی ہیں مربع عمارات کے گنبدوں کے نیچے اور اسی قسم کے اور خالی مقامات میں اس آرائش کا استعمال ہوتا تھا۔

گگروں اور سطح سے لٹکی ہوئی آرائشوں کا کثرت سے استعمال کرنا عربی طرز کی خصوصیات میں سے ہے۔ لیکن میں ہرگز موسیو شارل بلان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ عربوں کی غرض ان اُبھری ہوئی آرائشوں سے تاریکی پیدا کرنے کی تھی۔ فی الواقع ان گگروں سے عمارت میں مطلق تاریکی پیدا نہیں ہوتی علاوہ اس کے یہ آرائشیں عمارات کے اندر بھی جہاں تاریکی پیدا کرنا بالکل غیر ضروری ہے اسی کثرت سے ہیں جیسی عمارات کے باہر۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میناروں میں ان آرائشوں سے غرض ایک بلند کٹہرا پیدا کرنا ہے جہاں سے موذن اذان دے سکے کیونکہ قسطنطنیہ اور ایران کے میناروں پر بھی ایک کٹہرا ہوا کرتا ہے لیکن ان پر وہ مختلف الاقسام اُبھری ہوئی آرائشیں جو قاہرہ کی میناروں میں

موجود ہیں ہرگز نہیں پائی جاتیں۔ میری رائے میں تو ان آرائشوں کا سارا سبب یہ ہے کہ عربوں کو زاویوں سے اور سطحوں کے باہم تقاطع کے مقامات سے سخت نفرت تھی اور انہیں چھپانے کی غرض سے یہ آرائشیں ایجاد کی گئیں اور اُن کی ہر قسم کی صنعت میں یہ موجود ہیں خواہ وہ شے کوئی لکھنے کی دوات ہو یا کسی قرآن کی جلد یا کسی عمارت کا مینار۔

سنگی گلکاریاں اور کتبے

عمارات عرب کی آرائشوں میں ایک ایسی خصوصیت ہے کہ کوئی شخص فن تعمیر سے کتنا ہی ناواقف کیوں نہ ہو وہ فوراً ان عمارات کو پہچان لیگا۔

ان آرائشوں میں اشکال ہندسی اور کتبوں کی ہم آغوشیوں سے کچھ ایسی صورتیں بنائی گئی ہیں جن کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ اور مصور کا قلم ہی ان کو ادا کر سکتا ہے۔ موسیو برگائین نے ثابت کیا ہے کہ اگرچہ ان ترکیبوں میں ظاہرا بے انتہا پیچیدگی اور بے قاعدہ پن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن فی الواقع ان کی ساخت چند نہایت سادہ قواعد پر مبنی ہے۔

سنگی گل کاریاں جیسا کہ اکثر قاہرہ کی مسجدوں میں دیکھا گیا ہے پتھر پر تراشی جاتی تھیں یا جیسا الحمرا میں ہے مصالح میں بنائی جاتی تھیں۔

ان آرائشوں میں عربی حروف کا بہت بڑا حصہ ہے اور یہ نہایت خوب صورتی سے سنگی گل کاریوں میں گھل مل جاتے ہیں۔

نویں صدی عیسوی تک صرف کوفی حروف یا ان کے مشتقات یعنی ترطلی یا مستطیل کوفی حروف کتبوں میں مستعمل تھے۔

کتبوں میں اکثر آیات قرآنی ہیں اور زیادہ تر بسم اللہ الرحمن الرحیم یا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

خود عربی حروف اس درجہ خوبصورت ہیں کہ ازمنہ متوسط اور نشأۃ الثانیہ کے بناؤں نے اُن نمونوں کو جو اُن کے ہاتھ لگے محض آرائش سمجھ کر نقل کر دیا ہے۔ موسیولانگ پیریر اور موسیولادوآ اور دوسرے مصنفین نے ان کی مثالیں اکثر اطالیہ میں دیکھی ہیں۔ اس آخر الذکر مصنف نے تومیلان کے بڑے کلیسے کے بیت الخدمت میں ایک نکیلا محراب دار دروازہ دیکھا ہے جس کے گرد پتھر کی گگر تھی اور اس پر ایک عربی لفظ متعدد بار لکھا ہوا تھا۔ کلیسائے سنٹ پیٹر کے اس دروازہ پر جہاں پوپ یوژین چہارم کی مورت ہے حضرت عیسےٰ ؑ کے سر کے گرد عربی حرفوں کا ہالہ ہے۔ اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے کپڑوں پر بھی ایک ایک سطر عربی لکھی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس مصنف نے ان کتبوں کا ترجمہ نہیں دیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ حضرت عیسےٰ کے سر کے گرد لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہو۔

رنگین آرائشیں زمانہ دراز تک یہ اعتقاد رہا کہ یونانی اپنی عمارات اور مورتوں میں رنگ کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ اور چونکہ ان ہی کے خیالات پر رومیوں کی طرز کا بھی دارومدار رہا یورپ میں

ایک مصنوعی مذاق پیدا ہوگیا اور سادی سفید عمارت ہمیشہ نہائت خوبصورت سمجھی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی عمارتوں پر جب وقت دھوپ پڑتی ہے تو آنکھ نہیں ٹھیر سکتی نہ اس کی کوئی باریکی نظر آتی ہے لیکن مذاق اس کے عمدہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ مذاق جو یونانیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان کا اصلی مذاق نہ تھا۔ اور ان کی اکثر عمارات میں بہت کچھ رنگ آمیزیاں ہوا کرتی تھیں یونانی نیلے۔ زرد اور سرخ رنگوں کا استعمال زیادہ تر کیا کرتے تھے۔ ایثرین کے معبد میں ستونوں کے اوپر کا حصہ سرخ رنگا ہوا تھا اور اس سرخ زمین پر طلائی بجھوئے بنے ہوئے تھے۔ اس کے اوپر کے حصے پر جو محراب کے نیچے تھا نیلی زمین پر سرخ و سبز رنگ کے پھول بوٹے تھے۔

عربوں کی فطرت صناعی نے اِن رنگین عمارتوں کو سفید عمارتوں پر ترجیح دی۔ اُن کی نسخی گل کاریوں میں اقسام کی رنگ آمیزیاں نہائت عمدگی اور خوش سلیقگی سے کی گئی ہیں۔ الحمرا کی کل دیواریں پہلے زمانہ میں رنگین تھیں اور مساجد کی بیرونی دیواروں پر بھی اکثر اوقات رنگ ہوتا تھا۔

مصر میں عربوں نے سرخ اور نیلا اور زرد و سبز اور طلائی رنگ اختیار کیا۔ مسٹر اوین جونس جنہوں نے الحمرا کی بہت کچھ تحقیق کی ہے اور جن کے اہتمام سے لندن کے کرسٹیل پلیس کا بیت اللیوث

تیار ہوا ہے ثابت کیا ہے کہ یہ استثنا ان میناکار اینٹوں کے جو دیواروں کے
اجاروں پر نصب ہیں۔ الحمراء میں کل تین ہی رنگ استعمال کئے گئے
ہیں یعنے نیلا۔ سرخ اور طلائی جس میں زرد بھی شریک ہے ان رنگوں کی
تقسیم نہائت خوش سلیقگی کے ساتھ کی گئی تھی۔ گچی زمین کی آرائش پر
سب سے شوخ رنگ یعنے سرخ ہوتا تھا۔ نیلا رنگ دیواروں پر کیا جاتا
تھا سرخ اور طلائی رنگ کے دھبا کرنے کے لئے بہت بڑے
حصہ پر نیلا رنگ ہوتا تھا۔ بیچ بیچ میں رنگوں کی آمیزش کی غرض سے
سفیدی کی جاتی تھی۔ یا ابھری ہوئی آرائشوں کے ذریعہ سے گونہ تاریکی
پیدا کی جاتی تھی۔ ستون سب غالباً طلائی تھے کیونکہ سفید ستونوں کا اِن
رنگین آرائشوں کے ساتھ کوئی جوڑ نہ تھا۔

اس وقت الحمرا میں جو سبز اور بھورے اور ارغوانی وغیرہ رنگ
پائے جاتے ہیں ان کی نسبت مصنف مسبوق الذکر نے ثابت کردیا ہے
کہ یہ اُن مرمتوں کے وقت میں ہوئے ہیں جو وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں۔
غالباً یہ وہ رنگ ہیں جن کو اس قصر کو از سرِ نو درست کرنے والوں نے
بے تمیزی کے ساتھ تھوپ دیا ہے۔ ان حضرات نے جن حصوں
کو درست کیا ہے اور علے الخصوص ان تصاویر میں جو عموماً
فروخت ہوتی ہیں ہرگز ان اصول کی پابندی نہیں ہوئی جن کو
میں بیان کرچکا ہوں۔



عربی طرز کی تعمیر کی تقسیمیں

فن تعمیر کے اعتبار سے عربی عمارتوں کی کئی تقسیمیں ہوسکتی ہیں۔ جامع قرطبہ اور مصر کی جامع عمرو۔ جامع طولون۔ جامع قائیت بائی۔ غرناطہ کا قصر الحمراء۔ دہلی کا منارہ قطب۔ یہ سب عربی طرز کی عمارتیں ہیں مگر ان میں باہم بہت دور کی مشابہت ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان تقسیمات کو واضح کر دکھایا جائے۔

تقسیم اوّل۔ طرز عربی قبل اسلام

یہ طرز بالکل صاف نہیں ہے اور اس کی مثالیں یمن کی قدیم عمارات کے کھنڈر اور بعض اُن عمارات کی باقیات ہیں جو شام کی عربی حکومتوں میں مثل غسان وغیرہ کے پائی جاتی ہیں۔

تقسیم دوم۔ طرز شرقی عربی

شام کی شرقی عربی طرز وہ عمارات جو ساتویں صدی سے نویں صدی تک بنائی گئیں۔ یا از سر نو تعمیر ہوئی ہیں۔ جیسی مسجد حضرت عمرؓ اور مسجد اقصے بیت المقدس میں اور جامع دمشق۔

مصر کی شرقی عربی طرز وہ عمارات جو ساتویں صدی سے دسویں صدی تک بنی ہیں مثلاً مسجد عمرو و مسجد طولوں۔

افریقیہ کی شرقی عربی طرز | جامع مسجد قیروان اور مختلف مساجد الجزائر جو پرانے نمونوں پر تعمیر ہوئیں۔ افریقیہ میں شرقی اثر برابر قائم رہا اور آج تک گنبدوں کی صورت عموماً شرقی ہے۔

صقلیہ کی شرقی عربی طرز | وہ عمارتیں جو نارمنوں کی فتح سے پہلے بنیں مثلاً ضبزہ اور قوبع کے قصر۔

اندلس کی شرقی عربی طرز | مسجد قرطبہ اور طلیطلہ کی عربی یادگاریں آخر دسویں صدی کے ماقبل کی۔

تقسیم سوم۔ خالص عربی طرز

مصر کی طرز عربی | اس طرز میں دسویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی تک برابر تکمیل ہوتی رہی۔ اس طرز کے تغیرات اُن مساجد سے معلوم ہو سکتے ہیں جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ مسجد قائیت بائی میں اس طرز کا اعلیٰ عروج نظر آتا ہے۔

اندلس کی طرز عربی | اُندلس کی طرز عربی بھی ایک صدی سے دوسری صدی تک بدلتی رہی لیکن درمیانی زمانہ کی ضروری اسناد ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ صرف اشبیلیہ اور غرناطہ کی عمارتیں اچھی حالت میں رہ گئی ہیں۔ لیکن یہ اس طرز کی عمدہ مثالیں ہیں۔

تقسیم چہارم۔ ملی جلی ہوئی عربی طرز

اسپینی عربی طرز | عیسائی اور عربی طرز کی آمیزش عیسائیوں کے فتوحات کے اوائل ہی میں نظر آنے لگی۔ لیکن اس ملک کے بعض جنوبی حصوں میں یہ آج تک جاری ہے۔ طلیطلہ کی بہت سی عمارتوں میں یہ ملی جلی طرز نظر آتی ہے۔

یہودی عربی طرز | اس کی مثالیں طلیطلہ کی کئی پرانی یادگاروں میں موجود ہیں مثلاً سینٹا ماریا لابلانکا۔ اور التزانزیتو وغیرہ۔ جو کسی زمانہ میں اہل یہود کی ہیکلیں تھیں۔

ایرانی عربی طرز | وہ عمارات جو ایران میں بعد اشاعت اسلام تعمیر ہوئیں علی الخصوص مساجد اصفہان۔ اگرچہ ان عمارات میں عربی اثر موجود ہے تاہم ان میں ایک بیّن جدت پائی جاتی ہے۔

ہندی عربی طرز | وہ عمارات جو ان دونوں طرزوں کی آمیزش سے بنی ہیں مثلاً قطب صاحب کی لاٹ۔ بندرابن کا مندر اور علاء الدین کا عالیشان دروازہ۔

ہندی ایرانی عربی طرز یا مغلی طرز ہندوستان | وہ عمارات جو سلاطین مغلیہ کے وقت میں ہندوستان میں تعمیر ہوئیں علی الخصوص تاج بی بی کا روضہ قصر شاہان مغلیہ اور بہت سی مساجد۔ عربی طرز کی جگہ پر جو پہلے غالب تھی بہت جلد ایرانی طرز قائم ہو گئی۔ ان عمارتوں کی ایک خاص طرز ہے لیکن ان میں کوئی ذاتی جدت نہیں ہے۔ وہ مختلف طرزیں جو اختیار کی گئی ہیں الگ الگ نظر آتی ہیں اور ان میں آمیزش نہیں

ہوئی ہے۔

ہندوستان میں عربی طرز کی عمارتیں

جس وقت عربوں کے اثر کو جو انہوں نے دوسری اقوام پر ڈالا بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو دو باتیں پیدا ہوتی ہیں یعنے یا تو انہوں نے اپنے تمدّن کو ملک مفتوحہ میں پوری طرح سے جما دیا ہے جس کی مثال مصر ہے۔ یا یہ کہ انہوں نے ملک کے پرانے تمدّن کو اپنے تمدن کے ساتھ ملا لیا جیسا کہ ایران و ہندوستان میں ہوا۔ ہندوستان میں یہ دونوں تمدن اس درجہ باہم شیر و شکر ہو گئے کہ اس کا اثر مذہبی اعتقادات پر بھی پڑنے لگا۔ آگے چل کر اس تمدّن میں تیسرا جز تمدن ایران کا شامل ہو گیا جس کی وجہ سے اس میں ایک لطافت آگئی۔

ہندوستان کی ان عمارات کے دیکھنے سے جن کا بیان اب ہم کرینگے صاف معلوم ہو جائیگا کہ عربوں کا اثر مختلف ازمنہ میں کہاں تک پڑا ہے اور ان تینوں مختلف تمدنوں کا کتنا کتنا حصّہ ان یادگاروں میں ہے۔ اوائل کی تعمیروں میں جس کی مثال علاءالدین کا دروازہ ہے عربی وضع غالب ہے۔ اس میں ایران کا میل ہے تو سہی مگر کم اور خاص ہندی طرز تو بہت ہی کم ہے۔ ہندوؤں کے قدیم مندروں کی وضع عربی مذاق کے بالکل مطابق نہ تھی اور اس وجہ سے مسلمانوں نے اس میں سے بہت ہی کم حصّہ کو اخذ کیا۔

چند صدی بعد بھی عربی اثر موجود ہے لیکن خود عرب بہ تدریج دنیا کے پردہ سے غائب ہو چکے ہیں۔ ایرانی البتہ پیش پیش ہیں۔ اور ان ہی کا مذاق غالب ہے۔ عربی اور ہندی مذاق اس زمانہ کی عمارتوں میں کچھ تھوڑا بہت ہے مگر نہائت ہی کم۔

ہندوستان کی عمارتوں میں خالص عربی مذاق کا زمانہ بہت کم ہے۔ برخلاف اس کے وہ زمانہ جس میں بعد عربوں کے اس وضع تعمیر میں ایک انقلاب کلی ہوا ہے بہت ہی طویل ہے۔ دین اسلام کے نئے پھیلانے والے قوم عرب سے نہ تھے بلکہ ترک و مغل یعنی نیم وحشی اقوام تھیں۔ مثل اُن وحشیوں کے جنھوں نے رومیوں کے ملک فتح کر لیا انھوں نے بھی بالآخر اپنی مفتوحہ قوموں کے تمدن کو اختیار کیا مگر اِن کو اس ترقی کے حاصل کرنے کے لئے ایک زمانہ دراز درکار ہوا۔

اب ہم اپنی ترتیب کے مطابق ہندوستان کی اُن عمارتوں کا ذکر کریں گے جو عربی وضع ہیں یا جن میں عربی طرز کا میل ہے۔ یہ تاریخ جو پتھر کے حروف میں لکھی ہوئی ہے بمقابلہ عمارات طول طویل کے بہت زیادہ پُر بیان ہوگی۔

قطب صاحب کی لاٹ

عربوں کی سب سے قدیم عمارتیں ہندوستان میں وہ ہیں جو عیسوی بارھویں صدی کے اواخر میں تعمیر ہوئیں ان میں سے دو بہت قدیم ہیں جن کا زمانہ بارھویں صدی عیسوی کا

اوا خر ہے ۔ ایک تو قطب صاحب کی مسجد جو دہلی کے قریب ۱۱۹۰ء میں بنی تھی اور دوسری قطب صاحب کی لاٹ ۔ قطب صاحب کی لاٹ ایک ڈوریا دار مینار ہے اور اس کی صورت ایک لمبے مخروط کی سی ہے جس کے اوپر کا حصہ کٹا ہوا ہے ۔ اس مخروط پر جا بجا عربی نقش و نگار کے حلقے بنے ہوئے ہیں اور نیچے سے اوپر تک کئی پتھر کے تراشے ہوئے کٹہرے نصب کئے ہوئے ہیں ۔ یہ لاٹ جس کے صرف کٹہرے اور طرز آرائش عربی ہے قطب الدین کے وقت میں بنی تھی یا یہ کہا جائے کہ اس کے وقت میں ختم ہوئی تھی اور اسی وجہ سے بطور اختصار اسے قطب کہتے ہیں اور اسی نام سے وہ یورپ میں مشہور ہے ۔

اس لاٹ کی شکل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معمار ہندو تھے ۔ یہ لاٹ ہندوستان میں منجملہ عجائبات کے سمجھی جاتی ہے ۔ سر سید احمد خان بہادر جن کی ایک کتاب سے جو دہلی کے متعلق انہوں نے لکھی ہے موسیو گارسان دیتاسی نے نقل کیا ہے لکھتے ہیں " اس لاٹ کی شان اور خوبصورتی کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا اور اس کا مثل تمام عالم میں کہیں نہیں ہے " ان ہی کا قول ہے کہ اس لاٹ کو پتھورا نے ۱۱۴۳ء میں شروع کیا تھا اور قطب الدین نے فقط اس کام کو جاری رکھا ۔

قطب کے پاس ہی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ہے جو اصل میں پہلے ہندوؤں کا مندر تھا ۔ اس کی تعمیر کا زمانہ ۵۸۷ھ ہجری یعنی ۱۱۹۱ء ہے

علاؤالدین کا دروازہ

اسی حصار کے اندر جس میں قطب کی لاٹ اور مسجد ہے اور بھی چند یادگاریں واقع ہوئی ہیں جن میں سے ایک پتھورا کا مندر ہے لیکن سب سے زیادہ مشہور وہ یادگاری دروازہ ہے جسے علاؤالدین نے سنہ ۱۳۱۰ء میں تعمیر کیا۔ یہ نہ فقط نہائیت ہی حسین عمارت ہے بلکہ مسلمانوں کی فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ آج عربوں کی یادگاروں میں اس عمارت سے عمدہ کوئی عمارت نہیں ہے اور باستثنا چند دروازوں کے جو قصر الحمرا کے اندر واقع ہوئے ہیں میں نے کوئی چیز اس کے مقابلہ کی نہیں دیکھی۔ تناسب اجزا کے لحاظ سے اگر یہ دروازہ علاؤالدین کی یادگار کا راستہ نہ واقع ہوتا تو اسے کہہ سکتے تھے کہ یہ کسی عظیم الشان کلیسے کا روکار ہے۔

جو کوئی ان عمارات کی سچی تصویروں کو بغور دیکھے گا وہ اس حیرت انگیز صنعت کی قدر کریگا جسے ان عمارات کے معماروں نے نہ فقط مختلف اوضاع تعمیر کے ترکیب دینے میں صرف کیا ہے بلکہ اس ترکیب سے انہوں نے ایک نئی اور انوکھی طرز پیدا کی ہے دروازہ کے ستون ہندی وضع کے ہیں محرابوں کی طرز اور بہت بڑا حصہ آرائشوں کا عربی ہے اور عمارت کی مجموعی صورت کسی قدر ان دروازوں کو یاد دلاتی ہے جو ایران کی اس قسم کی عمارتوں میں ہوا کرتے ہیں۔

علاؤالدین کا دروازہ جس قدر عظیم الشان ہے اتنا ہی مستحکم بھی بنا ہوا ہے اندلس کی اینٹوں کی جگہ پر یہاں پتھر سے کام لیا گیا ہے

اور پتھر کے ترشے ہوئے گل بوٹے قصر الحمرا کے سادہ معالج کا کام دیتے ہیں۔

مقبرۂ التمش | مسجد قطب کے بعد مقبرہ التمش ہے جو ۶۳۳ہجری (۱۲۳۵ء) میں تعمیر ہوا۔ یہ عمارت بھی اسی طرز پر بنی ہے جس طرز پر علاء الدین کا دروازہ بنا ہوا ہے اور یہ بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی بہت قدیم یادگار ہے۔

بندرابن کا مندر | تمدن عرب کا اثر ہندوستان میں اس قدر پھیلا۔ کہ ہندوؤں نے بھی ان کی طرز کو اپنی قدیم عمارتوں کے لئے اختیار کیا۔ اس کی ایک عمدہ مثال بندرابن کے مندر کا ایک حصہ ہے۔ یہ عمارت شمالی ہندوستان کی طرز تعمیر پر بنی ہوئی ہے اور وہ محرابیں جو دروازہ کے سامنے نکالی گئی ہیں عربی اور ایرانی وضع کی ہیں

اکبر کا مقبرہ سکندرہ میں | باقی عمارتیں ہندوستان کی جن کا ذکر ہم کرنے والے ہیں سلطنت مغلیہ کے وقت کی ہیں۔

عربوں کا ملکی وجود ختم ہو چکا تھا اگرچہ علوم و فنون وصنعت و مذہب میں وہ اب بھی زندہ تھے لیکن ان چیزوں میں ان کے اثر کے مقابل میں ہندوؤں اور ایرانیوں کا اثر بھی قائم ہو گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں طرزوں سے مرکب ہو کر ایک نئی طرز پیدا ہوئی جس میں عربی خیال نظر تو آتا ہے مگر نہائت ہی ضعیف حالت میں۔

اس نئے زمانہ کی مشہور عمارتوں میں شہنشاہ اکبر کا مقبرہ ہے۔ جو دہلی[۱] سے قریب سکندرہ میں بنا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر کا زمانہ تقریباً ۱۶۰۰ء ہے

[۱] غالباً مصنف کی مراد آگرہ ہے۔

یہ مقبرہ اکبر کی زندگی ہی میں شروع ہوا تھا مگر اس کا اختتام شاہ جہان کے
وقت میں ہوا۔

اکبر تیمور کا پرپوتہ ہندوستان کے حکمرانوں میں سب سے جلیل القدر
بادشاہ تھا۔اس کے زمانہ سلطنت میں جو ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک تھا
ملک نے بے انتہا ترقی اور سرسبزی حاصل کی۔یہ زمانہ تعمیرات ہند کے لحاظ سے
اعلےٰ عروج کا زمانہ ہے۔کیونکہ اس بادشاہ کو عمارتوں کے بنانے سے
فی الواقع ایک شغف تھا۔۱۵۶۹ء سے دس سال تک اس نے آگرہ کے
نزدیک ایک میدان میں فتح پور کا قصر بنایا جس کا بقیہ اس وقت بھی ہمیں
ان سوتے ہوئے شہروں کی یاد دلاتا ہے جن کی تصویر الف لیلہ میں کھینچی
گئی ہے۔چند روز بعد ہی آب و ہوا سے تنگ آکر اس نے اس نئے پایۂ تخت
کو مع تمام مکانات اور حویلیوں اور مساجد اور آبادی کے چھوڑ دیا۔اُس
وقت سے یہ پر تکلف شہر جسے یورپ کی بڑی ریاستیں بھی اپنا دار السلطنت
بنانے کا فخر کریں صرف شیروں کا مسکن و ماوا ہو گیا اور انسان کی جنس سے
اس میں صرف چند فقیر رہ گئے۔

آگرہ کا روضہ تاج محل

آگرہ میں بہت سی مثالیں ہند و ایران و عرب کی
مرکب طرز تعمیر کی موجود ہیں۔ان میں سے سب سے زیادہ مشہور تاج بی بی
کا روضہ ہے جس کے بیان کے لئے ایک جلد چاہیئے۔اس عمارت کو
شاہ جہان نے ۱۶۳۱ء میں اس غرض سے شروع کیا تھا کہ یہ اس کی چاہتی
بی بی کا جس کے مرنے کا قلق کبھی اس کے دل سے دور نہیں ہوا ایک بےنظیر

مقبرہ اور یادگار رہو جس کا مثل دنیا میں نہ نکلے۔ اس نے مشرق کے تمام معماروں کو جمع کیا اور دور دور سے وہ نایاب اور بیش بہا پتھر منگائے جو اس عمارت میں لگے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کی تعمیر میں چھ کروڑ روپیہ صرف ہوا جس میں مزدوری کا حساب نہیں ہے کیونکہ مزدور مفت کام کرتے تھے۔ ٹیورنیر[۵۱] لکھتا ہے "ہر روز بیس ہزار مزدور بائیس برس تک اس روضہ میں کام کرتے رہے اگر اس رقم کو گنا بھی کر دیں تو اس خرچ سے یورپ میں ایسی عمارت کا بنانا محالات سے ہے۔

تاج محل سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے اور ایک بہت اونچے سنگ مرمر کے چبوترہ پر قایم ہے جس کی بلندی تقریباً ساڑھے پانچ گز ہے اور جس کا ہر ایک ضلع تقریباً ایک سو دس گز ہے۔ اس چبوترہ کے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں اور ایک ضلع اس کا جمنا سے ملا ہوا ہے اور دریا کی موجیں اس سے لہراتی رہتی ہیں۔ تین جانب کو باغ ہیں جن کی غیر معمولی تر و تازگی ایک عجیب لطف دیتی ہے۔ ان باغوں کے گرد ایک کنگرہ دار فصیل ہے اس میں داخل ہونے کے لئے ایک بڑا دروازہ ایرانی طرز کا بنا ہوا ہے۔

تاج محل کی اندرونی پیمایش حیرت انگیز ہے۔ گنبد کی چوٹی زمین سے تقریباً اٹھاسی گز بلند ہے۔ اس گنبد میں چار در و رخے ہیں جن میں سے ہر ایک تقریباً اکیس اکیس گز اونچا ہے۔ گنبد کے وسط میں شاہ جہاں کی ہیں

[۵۱] ٹیورنیر ایک فرانسیسی جوہری اور سیاح تھا جس نے ۱۶۴۵ء سے ۱۶۵۴ء تک ہندوستان میں سفر کیا۔ اس کا سفر نامہ دکن سلسلۂ آصفیہ میں ترجمہ ہو کر چھپا ہے اور اس کے شروع میں اس کی سوانح عمری بھی لکھی گئی ہے۔ سال پیدائش ۱۶۰۵ء سال وفات ۱۶۸۹ء۔ مترجم

بی بی اور خود اس کی قبر ہے۔
کل سیاحوں کی رائے ہے کہ یہ عمارت منجملہ عجائبات روزگار کے ہے ایک شخص نے جس کا نام نہیں معلوم پتّور سک میگزین[1] میں اس عمارت کا بیان لکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی تصویر بھی درج کی ہے جو پتھر کے نمونہ سے لی گئی ہے اور صحت میں عکسی تصویر کے برابر ہے۔ وہ یوں لکھتا ہے
"ساری عمارت سفید جلا کئے ہوئے سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور جب وقت اس پر آفتاب کی شعاعیں پڑتی ہیں تو آنکھوں میں چکا چوند آجاتی ہے اور نظر نہیں ٹھیرتی۔ اس حیرت انگیز عمارت کے دیکھنے کے لئے کچھ چاند ہی کی روشنی موزون ہے۔ سنگ مرمر کی کندہ کی ہوئی سلیں جن میں ایک بے نظیر باریکی اور لطافت کے ساتھ پھول پتے گلاب کی پنکھڑیاں اور عربی گل کاریاں بنی ہوئی ہیں۔ پتلے پتلے ستون۔ پر تکلف چوکھٹے۔ غلام گردشیں جن میں روشنی کے لئے جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ خالص سنگ مرمر کی باریک جالیاں۔ مختلف قیمتی پتھروں کی شوخ رنگ پچی کاری۔ سنگ موسے کے کتبے۔ غرض جو کچھ صنعت کی ندرت میں تھا وہ یہاں افراط کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور ایک ایسا مجموعی اثر پیدا کرتا ہے جس کا نظیر تمام عالم میں نہیں ہے۔
" دونوں قبریں سفید سنگ مرمر کی ہیں اور ان میں کتبے اور پھول بوٹے نہایت ہی تکلف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ پچی کاری کے پھول بوٹے

---

[1] ایک فرانسیسی بالتصاویر ماہانہ رسالہ کا نام ہے۔

جوان کے اوپر سے نیچے تک ہیں نہایت ہی خوبصورت ہیں۔ ہر ایک
پھول میں سو سے زیادہ مختلف رنگوں کے جلا کئے ہوئے پتھر جڑے
ہوئے ہیں جن کے میل سے وہ پھول پیدا ہوتا ہے جس کے دکھانے
کا ارادہ کیا گیا ہے۔ ان بیش بہا پتھروں میں سنگ زنگار۔ سنگ یشب۔
عقیق۔ زبرجد سرخ اور مختلف قسم کے بلور۔ سنگ سماق۔ اور زرد طلائی سنگ
مرمر کا جا بجا استعمال ہوا ہے۔ ہشت پہل کے اضلاع اور ان میں جو
محرابیں بنی ہوئی ہیں ان کے نیچے کی طرف سفید تراشی ہوئی سنگ مرمر کی
سلیں جو تقریباً ڈیڑھ گز اونچی ہیں نصب کی ہوئی ہیں اور ان کے گرد پچی کاری
کے چوکھٹے ہیں۔ سلوں پر انواع واقسام کے پھول بنے ہوئے ہیں اور
چوکھٹوں میں گل دان جن میں منبت کار پھول رکھے ہوئے ہیں۔ اسی
قسم کی کھدی ہوئی سلیں دروازوں کی محرابوں میں بھی نصب ہیں اور
ان دروازوں پر باہر کی طرف آیات قرآنی سنگ موسے سے
لکھی ہوئی ہیں۔"

یہ روضہ منجملہ ان شاذ اسلامی عمارتوں کے ہے جو انگریزوں کی عادی
دست برد سے بچی ہوئی ہے لیکن یہ محض ایک اتفاقی امر تھا۔ چونکہ
اس عمارت سے کسی قسم کی آمدنی نہ تھی لارڈ بنٹنگ نے جو ہندوستان
کا گورنر تھا یہ تجویز کی تھی کہ اس عمارت کو توڑ کر اس کی کل چاندی لے لی
جائے اور اس کا مال بصالح نیلام کر دیا جائے یہ تجویز ایک ایسی عمارت
کی بابت تھی جس کی نسبت کسی نے کہا ہے کہ محض اس کے دیکھنے کے لئے

ہندوستان تک سفر کرنا جائز ہے اور جو عمارت فی الواقع اس درجہ کامل ہے کہ اس کے مثل کو انسان کے ہاتھوں نے کبھی نہیں بنایا۔ مگر یہ خیالات تو فقط دانان کمال کے ہیں جن کو تجارت کا مطلق مذاق نہیں ہے۔ یہ تاجر تو عنقریب تمام دنیا پر قبضہ کرنے والے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ زمانہ بہت جلد آجائے کہ سیلو کی بنائی ہوئی وینس کی مورت بک کر اس کی قیمت سے پتھر توڑنے کا ہاون دستہ بنایا جائے۔

آگرہ کی موتی مسجد

میں آگرہ کی مشہور عمارات کے منجملہ موتی مسجد کا بھی بیان کرنا چاہتا ہوں جو شاہ جہان کے زمانہ کی عمارت ہے۔ اس عمارت کو اس نے ۱۶۵۶ء میں تعمیر کیا تھا۔ ہیبر انگریزوں کا رئیس الاساقفہ لکھتا ہے کہ اس مسجد کے دیکھنے کے بعد مجھے سخت شرم آئی کہ میرے مذہب کے معماروں نے کبھی کوئی عمارت ایسی نہیں بنائی جو اس خانۂ خدا کا مقابلہ کر سکے۔

جامع مسجد دہلی

مغلوں کے زمانہ کی بہت سی اسلامی عمارتیں دہلی میں موجود ہیں جن میں سے بعض کا بیان ہم بر سبیل اختصار کرینگے۔ ان میں پہلی عمارت جامع مسجد دہلی ہے جو ۱۰۶۰ہجری یعنے ۱۶۵۰ء میں تعمیر ہوئی یہ شاندار عمارت قلعہ کے میدان کے سرے پر واقع ہے اور اس میں جانے کے لئے بڑی بڑی سیڑھیاں ہیں جو ایرانی طرز کے دروازوں تک منتہی ہوتی ہیں۔ مسجد کی تعمیر سنگ سرخ سے ہوئی ہے۔ رد کار پر سفید سنگ مرمر اور سنگ موسے نہایت استادی سے لگایا گیا ہے۔

مثل ان عمارتوں کے جن کا ذکر ہو چکا ہے اس میں بھی ہندی و عربی و ایرانی طرز تعمیر ملی ہوئی ہے۔

دہلی کا بادشاہی قصر

اس قصر کو شاہ جہان نے بنایا اور اس کی تعمیر ۱۰۵۸ہجری یعنی ۱۶۴۸ء میں ختم ہوئی۔ اس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اس سے زیادہ پرشان کوئی اسلامی قصر ہندوستان و ایران میں نہیں ہے۔ اس کے ایوانوں کی مختلف الالوان پتھروں کی پچی کاری ہر ایک میں گنگا جمنی کا لطف دکھاتی ہے۔ ان کل وحشی اقوام کے ہاتھوں سے جنہوں نے متعدد اوقات میں دہلی کو لوٹا ہے یہ قصر جو فی الواقع عجائبات دنیا میں سے ہے بچا رہا لیکن انگریزوں نے اس پر رحم نہ کھایا۔ انہوں نے کل ان حصوں کو جو کام میں نہ آسکے منہدم کر دیا اور ان کے مصالح سے گویا خوبصورت فوجی مکانات بنائے۔ انہوں نے فقط ان ہی ایوانوں کو قائم رکھا ہے جو کبھی ان کے کام میں آسکیں۔ چونکہ ان میں نہائیت نازک رنگین پتھر جڑے ہوئے تھے اور فوجی طویلے اور گوروں کی خواب گاہیں بننے کے بعد ان کا صاف کرنا کسی قدر دشوار تھا اس لئے انہوں نے نہت انتظام کے ساتھ ان پر تکلف دیواروں پر چونا پھیر دیا۔ مگر ان کی اس حرکت پر اس قدر شور و غل مچا کہ ان جدید ملک گیران ہندوستان کو ضرور پڑا کہ اپنے جمائے ہوئے چونے کو کھرچ ڈالیں۔ اس طرح پر جو کچھ بچ بچا گیا ہے اس سے کافی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قصر کی حالت بربادی سے پہلے کیا تھی۔

موسیو روسلے بیان کرتے ہیں "اس قصر کا اندرونی حصہ اس قدر پر تکلف ہے کہ نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا۔ ستونوں۔ محرابوں اور لداؤ کی چھت کے حاشیوں پر عجیب و غریب عربی حروف کی گل کاریاں رنگ برنگ کے قیمتی پتھروں کی جو سنگ مرمر میں جڑے ہیں بنی ہوئی ہیں۔ آفتاب کی کرنیں جس وقت ان محرابوں میں سے ہو کر اس وجہ میں لانے والی پچی کاری پر پڑتی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھولوں کے ہار جو سنگ زنگار اور مختلف اقسام کے بلوروں اور دوسرے پتھروں سے بنے ہوئے ہیں۔ گویا زندہ ہو گئے"۔

اس قصر کو اس کے زمانہ عروج میں دو فرانسیسی سیاحوں نے دیکھا ہے ایک ان میں برنیر طبیب[1] تھا اور دوسرا ٹورنیر جوہری۔ ان کے سفرنامے ۱۶۷۰ء اور ۱۶۷۶ء میں شائع ہوئے اور ان میں ان تکلفات کا پورا بیان ہے۔ ٹورنیر کو تو اجازت مل گئی تھی کہ کل شاہی جواہرات کو جانچے اور ان کا نقشہ کھینچے۔ اس نے اپنی کتاب میں ان میں سے بیش بہا جواہرات کی تصاویر اور قیمتیں درج کی ہیں۔ اس قصر میں سات تخت تھے جو ہیروں سے جڑے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے بڑے

---

[1] برنیر ایک فرانسیسی طبیب تھا جو سند حاصل کرنے کے بعد دہلی آیا اور شاہجہان کا طبیب بن گیا اس نے اپنے بارہ سال کی اوقات میں اس زمانے کے بہت کچھ حالات معلوم کئے اور اس کا سفرنامہ نہائت دلچسپ ہے۔ اس سفرنامہ کا ترجمہ اردو میں بھی ہو لیا ہے سال پیدائش ۱۶۲۵ء سال وفات ۱۶۸۸ء۔ مترجم

تخت کی قیمت کا اندازہ ٹوڑنیر نے سولہ کروڑ پانچ لاکھ روپیہ کا کیا تھا۔

جن یادگاروں کا ہم نے ذکر کیا ہے اور جو تحریرات پرانے سیاحوں کی ہم تک پہنچی ہیں ان سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ سلاطین ہند کے درباروں کی حالت اس زمانہ میں کیا تھی جب کہ فرانس میں تیرھواں لوئی سلطنت کر رہا تھا جو کوئی سیاح دہلی کے قریب پہنچتا تو اسے ایک جنگل گنبدوں اور میناروں کا نظر آتا تھا جس کے پیچھے ہندوستان کا بے ابر اور نیلا آسمان تھا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد اسے سیکڑوں محلات اور پرستان کی سی عمارتیں نظر آتی تھیں جن پر انواع رنگ کے کام بنے ہوئے تھے جو ان کے حسن اور خوبی کی داستان کہہ رہے تھے اگر اس مسافر کو ان عجائبات کے مالک کا دیکھنا منظور ہو تو اسی قدر کافی تھا کہ وہ بادشاہ کی نماز کے وقت کو دریافت کر لے۔ اس وقت کے انتظار میں بہ یک نگاہ اسے اقسام کے باغ نظر آ جاتے جس میں جابجا جوہی یا نارنج یا ترنج یا دوسرے خوشبودار درختوں کے چمنوں کے اخیر میں جو خود اس کے ملک میں نہیں ہوتے کوشک ہیں جو رنگ برنگ کے پتھروں کی پچی کاری اور باریک سنگ مرمر کی جالیوں سے بنے ہوئے ہیں اور جن کی سفیدی کا عکس بڑے بڑے پانی سے لبالب حوضوں کی لہروں میں پڑ رہا ہے۔

اسی درمیان میں جب وہ ان عجائبات کو حیرت سے دیکھ رہا ہے اور اپنے جی میں کہہ رہا ہے کہ الف لیلہ کا جن بھی اس سے زیادہ خوبصورت

سماں نہیں پیدا کر سکتا دفعتہً ہزاروں باجوں کی آواز سے اُس سے معلوم ہوتا
کہ بادشاہ قریب آ گئے۔ شاہی قصر کے دروازہ سے ایک غول کا غول
خدمت گاروں کا نکلتا جن کی کمریں رنگین کپڑوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ پھر
سپاہیوں کے پرے جن کے ہتھیار چمک رہے ہیں۔ ان کے بعد سیاہ
فام غلام جن کے بالوں میں چاندی کا حلقہ پڑا ہوا زرین پالکیاں اٹھائے
ہوئے اور ان پر مخمل کے پردے پڑے ہوئے پھر ہندی اور ایرانی
اور ترکمان سواروں کے بیچ میں جن کے فولادی پیش قبض مثل شعلے
کے چمک رہے ہیں اور ارکان سلطنت کے جھنڈ میں جن کا لباس
سونے چاندی اور جواہرات سے درخشاں ہے ایک عظیم الشان ہاتھی
نہائیت شان سے قدم اُٹھاتا ہوا دکھائی دیتا اور اس کی ریشمی زرین جھول پر
جس میں ہیرے اور زمرّد جڑے ہوئے ہیں خود بادشاہ بیٹھے ہوئے نظر
آتے۔ یہ سارا گروہ اس شہنشاہ کے سامنے جو ظل اللہ علی الارض اور پندرہ
حکومتوں کا مالک ہے سجدہ کرتا ہے۔ بادشاہ آگرہ و دہلی و کابل و لاہور
و گجرات و مالوہ و بنگالہ و اسیر یہی ہے۔ مالک تمام مملکت ہندوستان
کا اس کے دونوں طرف ارکان سلطنت مور کے پروں کی چوریاں لمبی
نقش کار موٹھوں میں لگی ہوئیں اور جن پر موتی جڑے ہوئے ہیں لئے
ہلا رہے ہیں۔ اس ایشیائی تزک و احتشام پر جس کا رنگ ڈھنگ
عقل کو چکر میں لاتا ہے آفتاب جہاں تاب اپنی شعاعوں کا زرینہ
مینہ برسا رہا تھا۔

ایران میں عربی طرز کی عمارتیں

عربوں کے زمانہ کی عمارات ذابنیہ ایران میں اس قدر کم ہیں کہ ہم تحقیق کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ ان دونوں اقوام نے کس درجہ تک ایک دوسرے کی صنعت پر اثر ڈالا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ زمانہ جاہلیت میں ایران کی طرز تعمیر کیا تھی اور بعد اسلام کے کیا ہو گئی۔ جن پرانی عمارتوں کا پتہ ہمیں سیاحوں کے سفرناموں سے ملتا ہے وہ اس درجہ خستہ و خراب ہیں کہ اُن سے کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ وہ پہلے کیا تھیں۔ البتہ مورخین کے بیان سے اور ان کھنڈروں سے جو ابتک باقی رہ گئے ہیں اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ساسانیوں کے زمانہ میں جو عربوں کے ماقبل تھے شاہی مکانات کی تیاری اعلےٰ درجہ کی ہوا کرتی تھی۔ یہ لوگ گنبد سے بھی واقف تھے اور اپنی عمارتوں میں میناکار تختیوں کا استر لگانا بھی جانتے تھے اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اوائل فتوحات اسلام میں عربوں نے اس طرز عمارت کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ اختیار کر لیا تھا۔ اوائل سنین اسلام کی عمارات میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایران کا اثر کہاں تک ہے اور عربی وضع تعمیر کہاں تک۔ محض اپنی عمارات کی اندرونی آرائشوں میں اور ان میں میناکار تختیاں نصب کرنے میں عربوں نے ایران کی صنعت سے مدد لی تھی لیکن عمارات کی بیرونی وضع کو اقلاً شام و مصر میں اُنہوں نے مشرقی معماروں سے اخذ کیا تھا۔ بہت دنوں بعد خود عربوں کی تعمیر کا اثر

ایران پر پڑا اور ایرانیوں نے عربی گنبد کی وضع اور مختلف قسم کی اندرونی
آرائشوں اور کتبوں کو عربوں سے سیکھا۔

فی الواقع ایران میں خلفائے اوّلین کے زمانہ کی یادگاریں بہت
ہی کم رہ گئی ہیں۔ ان میں سے مسجد ہمدان ہے اور نیز بعض مساجد
مشہد جنہیں موسیو خانی کاف اسی زمانہ کا بتلاتے ہیں۔ ان عمارتوں میں
عربی اور ایرانی طرز ملی ہوئی ہے۔ محرابیں اور مخروطی میناروں میں
کٹہرے کا صرف چوٹی کے قریب ہونا اور آرائش میں مینا کار
تختیوں کا استعمال ایرانی طرز کے بموجب ہے اور اندر کے گل بوٹے
اور قلم کاریاں اور لمبے لمبے ستون عربی ہیں۔

زمانۂ خلفا کی ٹوٹی پھوٹی عمارات میں جو اس وقت ایران میں موجود
ہیں اور اُن میں جن کو شاہ عباس نے اصفہان میں بنایا ایک خاص
مشابہت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عمارتوں کے بنانے
والے کسی ایک بہت قدیم طرز کی تقلید کر رہے تھے۔ اس قدیم طرز میں
بتدریج بہت کچھ ترمیم کی گئی علی الخصوص گنبدوں کی وضع میں۔ یہ گنبد
پہلے کسی قدر پچکے ہوئے ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ نیم کروی
ہو گئے اور پھر ان کے نیچے کا حصہ سمٹنے لگا یہاں تک کہ ان کی صورت
شلجم کی سی بن گئی۔

بہر حال ان عمارتوں کی اصلی وضع ایرانی ہے۔ میناروں کا مخروطی ہونا
دروازوں کی محراب کا بیچ میں نکیلا پن اور دونوں جانب سے پھیلاؤ دیواروں پر

میناکار تختیوں کا نصب ہونا اور اقسام کی رنگ آمیزیاں یہ تمام نشانیاں ایرانی صنعت کی ہیں۔ اور جس وقت ہم ان ہی خصوصیات کو ہندوستان کی عمارات میں پاتے ہیں تو یقین ہوتا ہے کہ یہ طرز ایران سے آئی ہے۔

جس وقت مغلوں نے عربوں کا ملک لے لیا تو انہوں نے ان کے مذہب اور ان کے تمدن کو بھی اختیار کیا لیکن ایران اور ہندوستان میں مغلوں نے ہندی اور ایرانی معماروں سے کام لیا۔ اور ان کاریگروں نے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا دونوں طرزوں کو ملا دیا۔ سمرقند میں جس کو تیمور نے ۱۳۶۹ء میں اپنا دار السلطنت قرار دیا تھا اور جو اس وقت نصف اُجاڑ پڑا ہوا ہے ان کھنڈروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ طرز تعمیر میں ایرانی وضع غالب تھی۔ ہندوستان میں عربوں کا اثر ابتدا میں خفیف تھا اور پھر بہت زیادہ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مغل اپنے ساتھ کوئی خاص طرز تعمیر نہیں لائے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس ملک میں آنے کے بعد اُنہوں نے ایک ایسی خاص طرز پیدا کر لی تھی جو ان کی مختلف رعایا کے مختلف مذاقوں کی لُب لباب تھی۔

عربوں نے جو کچھ اثر ایران پر ڈالا اگر ہم اُسے چند لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو یہ کہینگے کہ یہ اثر زیادہ تر مذہب اور علوم و فنون و زبان سے متعلق تھا اور عادات و اخلاق و طرز تعمیر پر بہت ہی کم پڑا تھا

ایرانیوں نے بہ عوض اس کے کہ اپنی فاتح قوم کے تمدن کو پوری طرح اختیار کر لیں جیسا کہ مصریوں نے کیا تھا مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنے پرانے تمدن کے بعض اجزا کو قائم رکھا۔

بغداد کی عربی عمارتیں

مغلوں نے ۶۵۶ہجری (۱۲۵۸ء) میں بغداد پر قبضہ کیا۔ شہر میں قتل عام ہوا اور معتصم باللہ اخیر عباسی خلیفہ ہلاکو خان بادشاہ مغل کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ساری دولت لٹ گئی۔ کتابیں کچھ جلا دی گئیں اور کچھ دجلہ میں پھینک دی گئیں۔ قطب الدین الحنفی[1] لکھتا ہے "ان شائقین علوم و فنون نے اس واقعہ سے پہلے اس قدر علمی ذخیرہ جمع کیا تھا کہ جب وقت مغلوں نے مدارس کی کتابوں کو دجلہ میں ڈال دیا تو ان کے آپس میں مل جانے سے ایک پل تیار ہو گیا جس پر سے سوار و پیدل بخوبی گذر سکتے تھے اور دریا کا پانی بالکل سیاہ ہو گیا"

لیکن ان وحشیوں نے بھی جنہوں نے عمارتوں کو اور کتابوں کو جلا دیا اور ہر ایک چیز کو جو ان کے سامنے آئی برباد کر دیا بالآخر انہیں مغلوب عربوں کے تمدن کو قبول کر لیا۔ خود ہلاکو خان جس نے بغداد کو لوٹا اور اخیر عباسی خلیفہ کی لاش کو شہر کی فصیل سے لٹکایا عربوں کی حیرت انگیز ترقی سے جو اس کی نظروں میں ایک نئی چیز تھی اس قدر تعجب میں آیا کہ وہ خود ان کا حامی اور محافظ بن گیا۔ مغلوں نے عربوں کے مدارس میں علم حاصل کیا

[1] قطب الدین عبدالکریم بن عبدالنور الحلبی الحنفی (سنہ ۷۳۵ھ) کی بہت سی تصانیف ہیں اور اس کی تاریخ قطب الدین مشہور ہے۔ اس تاریخ کی ابتدا کے سنہ تقی الدین نے تکمیل کی۔ مترجم

ان کے مذہب اوران کے تمدن کواختیار کیا اوران کے علما اور اہل کمال کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ ہم دیکھیں گے کہ ان ہی مغلوں نے تھوڑے دنوں بعد ہندوستان میں ایک بڑی سلطنت قایم کی جسے ہم سلطنت عرب کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں عربوں ہی کے تمدن نے ملک کے پرانے تمدن کی جگہ لی۔ اوراس وقت تک وہاں حکومت کی۔

بغداد تھوڑے دنوں میں سنبھل گیا لیکن تین صدی بعد وہ ترکوں کے قبضہ میں آیا اور ہمیشہ کے لیئے برباد ہوگیا۔ کتب خانے۔ مدارس۔ علما۔ اہل کمال سب دفعتہً ہمیشہ کے لیئے غائب ہوگئے۔

بغداد اس وقت بھی ایک بہت بڑی تجارت گاہ ہے لیکن یہ ایک نیا شہر ہے اوراس میں خلفا کے زمانہ کی یادگاریں اگر ہیں بھی تو خراب وخستہ حالت میں۔ جو ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر بھی آتی ہیں وہ ایرانی ہیں اور عربوں کے زمانہ کی نہیں۔ موسیو فلاندین لکھتے ہیں " بہت سی گرد کے نیچے دبی دبائی ہوئی چند مکانات کی بنیادیں نکلی ہیں جن میں بہ مشکل ہارون الرشید اور زبیدہ کی یادگار نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں بازاروں کے گوشوں میں یا دریا کے کنارہ ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے ملبے میں جن کا نام تک مفقود ہوگیا ہے دیواروں کا مصالح مل جاتا ہے جس کے کتبے کے کوئی حروف بہ مشکل پڑھے جاتے ہیں۔ کہیں کوئی مینار نظر آجاتا ہے جس کی خستہ وخراب حالت اس کی قدامت کی دلیل ہے کہیں اتفاق سے

کوئی محراب مل جاتی ہے جس پر مینا کار کا کام بنا ہوا تھا اور اس نقش و نگار کا رنگ چھوٹ کر کسی پرانی بنیاد پر گر پڑتا ہے بلا اس کے کہ کسی ترک کو اس قدیم ترقی کی نشانیوں کے مٹ جانے پر جو حکومت مشرقی کی ترقی کی ہم پلہ تھی ہنسکرانے کا موقع ملے۔ باستثنا ان باقیات کے جو نہ فقط کم یاب بلکہ بالکل بیکار ہیں بغداد کی خاک میں سے کوئی چیز بھی نہیں نکلتی اور یہہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شہر میں کوئی ایسی یادگار باقی نہیں رہی جو خلفا کو یاد دلائے۔"

یہ ہے اس وقت کی حالت بغداد کی۔ خلفا کا پرانا دارالخلافت اسی گردروزگار میں جا ملا جس میں اس وقت نینوی۔ بابل اور ممفس پڑے سو رہے ہیں۔ ان دارالسلطنتوں نے بھی کسی زمانہ میں دنیا پر حکومت کی تھی لیکن ان کی حکومت محض فوجی حکومت تھی۔ برخلاف اس کے جو خلفا بغداد پر حکمران رہے اُنہوں نے اپنے تمدن کے ذریعہ سے حکومت کی۔

شام کی عربی عمارتیں

اگرچہ وہ عمارات اور یادگاریں جو عربوں نے شام چھوڑی ہیں بغداد میں زیادہ نہیں لیکن چونکہ وہ نہایت قدیم اور با وقعت ہیں ان کا بیان ضروریات سے ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ایام جاہلیت میں بھی عربستان میں بڑے بڑے شہر تھے اور خانہ کعبہ جس میں اس وقت تین سو سے زیادہ بُت

موجود تھے ایام جاہلیت ہی کی عمارت ہے لیکن افسوس یہ ہے۔ کہ اس مشہور عمارت میں وقتاً فوقتاً اس قدر تغیر ہوا ہے اور اتنی مرتبہ از سر نو تعمیر ہوئی ہے کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں لگتا کہ اس کی اصلی وضع تعمیر کیا تھی۔ یہ البتہ ممکن ہے کہ ان متواتر تغیرات میں بھی بعض حصے عمارت کے اپنی قدیم وضع پر چھوڑ دئے گئے ہوں۔

بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ ابتدائے اسلام میں جو کچھ عمارات عربوں کے نام سے تعمیر ہوئیں ان کے بنانے والے خود عرب نہ تھے مثلاً انہوں نے جو کچھ تبدیلیاں گرجوں اور کلیسوں میں ان کو مساجد بنانے کی غرض سے کیں یا جو عمارتیں انہوں نے قدیم عمارات کے مال مصالح سے تعمیر کیں ان کے بنانے والے حقیقت میں وہی معمار تھے جو اُن مفتوحہ ملکوں کے باشندے تھے۔ بس گویا وہ کاریگر جن سے عربوں نے شام میں کام لیا زیادہ تر یا ایرانی تھے یا مشرقی۔ عربوں کی نسبت ان معماروں کے ساتھ ویسی ہی تھی جیسی کسی نئے امیر کی ہوتی ہے جو اپنی نئی دولت کو عمارت کے بنانے میں صرف کرتا ہے اور ایسی صورتوں میں بنانے والا کوئی کیوں نہ ہو عمارت کی وضع میں ہمیشہ مالک کے ذاتی خیالات شامل رہتے ہیں۔ ان ایرانی اور مشرقی معماروں کو بھی ضرور تھا کہ تعمیر کی وضع میں عربوں کے خیالات کی پابندی رکھتے اور یہی وجہ ہوئی کہ تھوڑے ہی زمانہ کے بعد عربوں کی عمارات نے ایک ایسی خاص وضع پیدا کر لی اور ان کی اندرونی آرائشیں اور گل کاریاں کچھ ایسی خاص وضع پر

ترتیب دی گئیں کہ ان میں اور دوسری عمارات میں ایک بیّن فرق معلوم ہونے لگا۔ یہ ممکن ہے کہ اختلاف ملک کے لحاظ سے آرائشوں اور گل کاریوں کی ترکیب کہیں ایرانی اور کہیں مشرقی اور کہیں ہندی ہو لیکن عمارت کی مجموعی وضع اور اس کے مختلف حصوں کا تناسب بالکل عربی ہے۔ اب ہم چند عمارتوں کا بیان لکھتے ہیں جو عربوں نے شام میں چھوڑی ہیں۔

مسجد حضرت عمرؓ

مسجد نبوی ؐ کے بعد مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ اس قدر متبرک نہیں ہے جیسی مسجد بیت المقدس جو حضرت عمرؓ کے نام سے مشہور ہے اور بہت تھوڑے دن ہوئے ہیں کہ کوئی یورپین اس کے اندر قدم رکھنے کا مجاز نہ تھا۔ پہلی جنگ صلیبی میں جس وقت نصرانی بیت المقدس میں داخل ہوئے ہیں تو یہی ایک عمارت تھی جس نے انہیں حیرت میں ڈالا تھا۔ اُن کے خیال میں یہ ہیکل سلیمانی کا بقیہ تھا اور اس کی شہرت یورپ میں اس قدر ہوئی کہ بہت سے کلیسے اس کی وضع پر تعمیر کئے گئے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہی ایک دینی عمارت ہے جو مساوی طور پر یہود اور عیسائیوں اور مسلمانوں کی نظروں میں متبرک ہے حضرت عمرؓ کی مسجد اُسی مقام پر تعمیر کی گئی ہے جہاں مشہور ہیکل حضرت سلیمانؑ تھی اور جسے ہیرڈ[1] نے دوبارہ بنایا تھا۔ جس وقت

[1] ہیرڈ (ہیرودس) بزرگ یہودا (جوڈیا) کا بادشاہ تھا اس نے اپنی بی بی مریم اور دو بیٹوں کو قتل کرایا اور ہیکل کی از سرِ نو تعمیر کی سال پیدائش ۷۳ قبل مسیح سال وفات ۴ قبل مسیح۔ مترجم

ٹیٹس[۱] اس عمارت کو جل جانے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا تو خود وہ بھی ایک لمحہ کے لئے اسے دیکھ کر حیرت میں آگیا تھا۔ اسی عمارت کے اندر وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹےؑ کو قربانی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ دنیا میں کم مقامات اس قدر متبرک ہونگے اور اس میں شک نہیں کہ بجز اس کے کوئی مقام ایسا نہیں جہاں اتنی مختلف قسم کی پرستشیں ہوئی ہوں۔ حضرت سلیمانؑ نے یہاں خدائے یہود کی عبادت کی۔ رومیوں نے اپنے خدا جوپٹر کو جو خدائے خدایان اور خدائے عالمیان ہے یہاں پوجا۔ صلیبیوں نے یہاں حضرت عیسےٰؑ کی مورت رکھی اور آج پیروان دین اسلام اپنے اُس خدا کی پرستش کرتے ہیں جس کے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ مسجد حضرت عمرکی وقعت محض تاریخی یادگاروں کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک اعلےٰ درجہ کی عمارت ہے اور فلسطین کی کل عمارات میں سربرآوردہ ہے۔

یہ مسجد ایک بہت بڑے میدان میں واقع ہوئی ہے جس کا طول تقریباً ساڑھے چار سو گز اور رقبہ ربع شہر بیت المقدس کے برابر ہے۔ اس کے گرد ایک حصار ہے جسے اب حرم شریف کہتے ہیں اور اس حصار کے اندر کئی مشہور عمارتیں ہیں۔ جن میں زیادہ مشہور مسجد الاقصےٰ ہے۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوگیا ہے کہ حرم کی سطح فی الواقع کوہ موریا کی

---

[۱] ٹیٹس روم کا دسواں شاہنشاہ تھا اس کے وقت میں بیت المقدس فتح اور برباد کیا گیا ۷۰ء ؁ سال پیدائش ۴۰ء ؁ سال وفات ۸۱ء ؁ - مترجم

چوٹی تھی جس کے ارد گرد بھرا و ڈال کر حضرت سلیمان عہ نے اپنی ہیکل کے لئے ایک مسطح جگہ بنائی تھی۔ یہودی بادشاہوں نے اور علے الخصوص ہیرڈ نے کئی مرتبہ کی تجدید میں اس دائرہ کو بڑھالیا۔ وہ متبرک پتھر جو اس وقت مسجد کے وسط میں واقع ہوا ہے شائد پہاڑ کی چوٹی ہے جسے حضرت سلیمان نے مسطح کرتے وقت علی حالہ رہنے دیا تھا۔

مسجد ایک مربع چبوترے پر بنی ہوئی ہے جو حرم کی سطح سے تقریباً سوا تین گز بلند ہے اور بجنسہ اسی مقام پر ہے جہاں ہیکل سلیمانی تھی۔ اس چبوترے تک پہنچنے کے لئے کئی زینے متعدد سیڑھیوں کے بنے ہوئے ہیں اور ان کے اوپر نوک دار محرابیں نہائت خوبصورت سنگ مرمر کے ستونوں پر رکھی ہوئی ہیں۔

حرم کے چبوترے پر اقسام کی چیزیں بنی ہوئی ہیں۔ مثلاً وعظ کا ممبر نماز پڑھنے کے مصلے وغیرہ وغیرہ اور ان میں سے بعض نہائت قدیم اور عجیب ہیں۔

اس عمارت کو مسجد حضرت عمرؓ کہنا اہل یورپ کی غلطی ہے۔ کیونکہ فی الواقع نہ یہ عمارت مسجد ہے اور نہ اس کو حضرت عمرؓ نے تعمیر کیا۔ خلیفہ عمرؓ بہت تھوڑے دنوں بیت المقدس میں رہے اور انہوں نے صرف تعمیر کا مقام بتا دیا تھا۔ موسیو دے دوگے کی تحقیقات کے رو سے یہ عمارت سنہ ۷۲ ہجری (سنہ ۶۹۱ء) میں تعمیر ہوئی جو کہ حضرت عمرؓ کے بعد کا زمانہ ہے۔ عرب اس کو قبۃ الصخرا کے نام سے پکارتے ہیں۔

اور فی الحقیقت اس عمارت کو ایک عظیم الشان گنبد کہنا چاہئے جو اس متبرک پتھر کو ڈھانکے ہوئے ہے۔

اس عمارت کی مجموعی حیثیت تو ہمیں مشرقی وضع تعمیر کو یاد دلاتی ہے لیکن اس کو مختلف اوقات اور مختلف قرنوں میں خلفائے اسلام نے از سر نو تعمیر اور ترمیم کیا ہے اور اس وجہ سے اس کے اندر ہمیں مختلف قرون اسلام کی صنعت کے نمونے نظر آتے ہیں[۱]۔

مسجد حضرت عمر کی صورت ہشت پہل ہے اور اس میں چار دروازے جہات اربعہ کی طرف نصب ہیں۔

اندر کی دیواروں پر اجارہ تک سنگ مرمر کا استر ہے اور اس سے اوپر چینی کی مینا کار تختیوں کی پچی کاری ہے اور اُن میں انواع واقسام کے

[۱] مسجد حضرت عمر اور عربوں کی دوسری عمارتوں کے بیانات جو ہم نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں نہایت مختصر ہیں جن عمارات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کے پورے بیان کے لئے کم و بیش ایک جلد کتاب کی ضرورت ہے مثلاً موسیو دے دوگے نے صرف مسجد حضرت عمرؓ کے بیان میں ایک پوری کتاب لکھی ہے اور ادین جونس نے دو بڑی جلدوں میں جن میں تصویریں کثرت سے ہیں صرف قصر الحمرا کا بیان لکھا ہے اسی طرح پریس دادین نے قاہرہ کی عمارتوں کو تین جلدوں میں بیان کیا ہے۔ اکثر سیاحوں کی کتابوں میں عربوں کی عمارات کا نام ہی نام درج ہے نہ تصویریں ہیں اور نہ بیانات اور انہیں کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ ایک صحیح تصویر سیکڑوں صفحہ کی تحریر کا کام دے سکتی ہے۔

خوبصورت گل بوٹے دکھائے گئے ہیں۔ یہ تختیاں ایرانی ساخت کی ہیں۔ اور مسجد کی تعمیر سے بہت دنوں بعد لگائی گئی ہیں۔ یعنے ان کا زمانہ شاہ سلیمان پرشکوہ کا ہے (۱۶۹۶ء) اس عمارت پر جب وقت آفتاب کی شعاع پڑتی ہے تو یہ تختیاں مثل جواہرات کے چمکنے لگتی ہیں اور ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ یورپ کی سادی اور دھندلی دیواروں میں ہرگز یہ رنگ آمیزی اور چمک نہیں نظر آتی جیسی کہ اس مسجد کی دیواروں میں ہے۔ حقیقت میں مجموعی اثر اس کا ایک خواب وخیال کی کیفیت دیتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی طلسم کے مکان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو مسجد کی خوبی اور نزاکت خواب وخیال سے بھی مافوق ہے۔

مسجد کے اندر کا نقشہ نہایت سادہ ہے یعنے عمارت کے وسط میں وہ متبرک پتھر ہے۔ اس کے گرد ایک گول کٹہرہ اور اس کے چاروں طرف دو ہشت پہل ہم مرکز احاطے ایک دوسرے کے اندر۔

اندرونی آرائش اور گلکاری بہت ہی اعلےٰ درجہ کی ہے۔ باہر کے احاطے کے ستون ایک ڈھال کے سنگ مرمر کے ہیں اور ان کی اونچائی اور تراش مختلف ہے جس سے ان کی قدامت ثابت ہوتی ہے۔ ستونوں کے پرکالے بھی مختلف تراش کے ہیں اور اکثر سلطنت مشرقی کے ابتدائی زمانہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ دیواروں میں اوپر کی طرف رنگ برنگ کے خوبصورت پتھر نصب ہیں جو ظاہرا دسویں صدی کے ہیں۔ گنبد کے نیچے کے حصے

میں ایک چوڑا سا منطقہ بنا ہوا ہے جس میں وہ آیات قرآنی جو حضرت مسیح ؑ سے متعلق ہیں سونے کے حرفوں سے کوفی خط میں لکھی ہوئی ہیں۔

یہ گنبد ۱۰۲۲ء میں جو عربی صنعت کی اعلیٰ ترقی کا زمانہ ہے دوبارہ تعمیر ہوا تھا اور اس وجہ سے اس کی اندرونی تیاری نہایت ہی عمدہ ہے یعنی اس میں انواع اقسام کی رنگ آمیزیاں پچی کاریاں اور پیچدار گلکاریاں جو عربی صنعت کے خواص میں سے ہیں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو رہی ہیں۔ مسجد کے تمام اندرونی حصہ میں بے انتہا تکلف کیا گیا ہے۔ دیواروں میں میناکار تختیاں رنگیں پتھروں کی پچی کاری۔ سونے کی تحریریں اور کالسنی کے منبت کتبے جڑے ہوئے ہیں۔ کھڑکیوں میں سولہویں صدی کے رنگین شیشے لگے ہوئے ہیں۔ ان شیشوں میں خاص بات یہ ہے کہ جیسا یورپ میں دستور ہے یہ سیسے کے پتروں سے نہیں جمائے گئے ہیں بلکہ ایک خاص مصالح سے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کھڑکیوں سے روشنی کی کمی بیشی کا مجموعی لطف اُس سے بہت زیادہ ہے جو ہمارے کلیسوں میں حاصل ہوتا ہے۔

مسجد کے وسط میں وہ مشہور متبرک پتھر ہے جسے عرب الصخرا کہتے ہیں اور اس پتھر پر ملکے زدک اور حضرت ابراہیم ؑ اور حضرت داؤد ؑ اور حضرت سلیمان ؑ نے قربانیاں کی ہیں۔

اب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ پتھر جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں خود کوہ موریا کی چوٹی ہے جسے حضرت سلیمان نے پہاڑ کو مسطح کرتے وقت

قایم رہنے دیا تھا اور یہ اسی وقت سے متبرک مانا جاتا ہے اور بلاشبہ یہہ ہیکل سلیمانی کا قدیم مذبح ہے۔ اِس پتھر کا زیادہ سے زیادہ طول تقریباً ساڑھے اٹھارہ گز ہے اور یہ زمین سے تقریباً دو گز اونچا ہے۔ جنگ صلیبی کے زمانہ سے اس کے گرد ایک لوہے کا کٹہرا لگا دیا گیا ہے اوپر کی جانب ایک طاق ہے جسے حضرت داؤد ؑ اور حضرت سلیمان ؑ کی عبادت گاہ بیان کرتے ہیں۔

مسجد کے گنبد پر ایک بہت بڑا ہلال بنا ہوا ہے۔ حرم ہی کے احاطہ میں مسجد کے مقابل ایک سنگ مرمر کی عربی وضع کی کرسی ہے۔ اس کرسی پر ایک چھوٹا گنبد ہے جو نغل اپنی محرابوں پر رکھا ہوا ہے۔ اس کرسی کو حضرت عمرؓ کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اس کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے زمانہ سے بہت بعد کی بنی ہوئی ہے اور فی الواقع اس کی ساخت پندرھویں صدی عیسوی کی ہے۔

منجملہ اور مشہور عمارات کے جو اس حرم کے احاطہ میں ہیں مجھے اس چھوٹی عمارت کا بیان کرنا ضرور ہے جسے قبۃ السلسلہ یا حضرت داؤد ؑ کی عدالت کہتے ہیں۔ یہ ایک پتھر کا قبہ ہے مشرقی وضع کا جس میں ایران کا مینا کاری کام کیا ہوا ہے۔ روایت یہ ہے کہ حضرت داؤد ؑ اپنی عدالت اسی مقام پر کیا کرتے تھے۔

مسجد اقصے اسی احاطہ میں مسجد اقصے بھی ہے جو مسجد حضرت عمرؓ سے قدامت میں کم نہیں۔ یہ اصل میں ایک کلیسہ تھا۔ جسے شہنشاہ

جسٹینین[1] نے حضرت مریم کے نام پر تعمیر کیا تھا اور عربوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اُسے مسجد بنالیا۔ یہ مسجد زلزلہ میں ایک بار منہدم ہوگئی تھی۔ اور ۱۰۵۰ء میں دوبارہ تعمیر کی گئی اور مختلف اوقات میں ایسے تغیر و تبدل ہوتے رہے جن سے روز بروز اس میں عربی طرز عمارت کا رنگ جلوہ دینے لگا۔ صلاح الدین نے پھر اس کی تجدید ۵۸۳ھ ہجری (۱۱۸۷ء) میں کی۔ اس کے دوسرے حصے مثلاً سائبان وغیرہ پندرھویں صدی عیسوی میں درست کئے گئے۔

اس مسجد کے اندر کے ستون مختلف عمارتوں سے لئے گئے ہیں بیچ کے نو ستون مشرقی ہیں اور غالباً ساتویں صدی عیسوی کے بنے ہوئے۔ اس کی محرابیں زیادہ نوکدار رہیں۔ جنگ صلیبی کے زمانہ میں نصاریٰ اس مسجد میں ٹھیرے تھے اور اس وقت بھی اس میں ایک دالان موجود ہے جس میں اُن سپاہیوں کے ہتھیار رکھے گئے تھے۔

اس مسجد میں ایک نہائت خوبصورت محراب ہے جس میں پتھروں کی پچی کاری ہے۔ اس پر ایک کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محراب ۵۸۳ھ ہجری میں صلاح الدین نے بنائی تھی۔ یہیں پر ایک عجیب و غریب کھدی ہوئی لکڑی کی کرسی ہے۔ جس میں ہاتھی دانت

---

[1] جسٹینین مشرق کا شاہنشاہ تھا۔ اس نے اس معروف قانون کو جمع کیا جو آج تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ سال ولادت ۴۸۳ء سال وفات ۵۶۵ء۔ مترجم

اور سیپی جڑی ہوئی ہے۔ اس پر بھی ایک کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرسی ۵۶۴ھ ہجری (۱۱۸۶ء) میں بنائی گئی تھی اور محراب پر جو کھڑکیاں ہیں ان کے شیشے سولہویں صدی عیسوی کے ہیں۔ مسجد کے جانب راست چپ دو عجیب و غریب قدیم مصلے ہیں۔ ان میں سے ایک جس کی محراب نوکدار ہے اور جس کے ستونوں میں بل پڑے ہوئے ہیں حضرت عمرؓ کے نام سے مشہور ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ نے یہاں نماز پڑھی تھی۔ دوسرے مصلے کو عموماً حضرت زکریا کا مصلے کہتے ہیں

عربوں کی دوسری یادگاریں بیت المقدس میں۔

بیت المقدس میں عربوں کی اور یادگاریں بہت کم ہیں جن کا ذکر کیا جا سکے۔ لیکن ہم یہاں باب الدمشق کا ذکر ضرور کرینگے جو بہت خوبصورت بنا ہوا ہے اور جسے ۹۴۴ھ ہجری (۱۵۳۷ء) میں شاہ سلیمان نے از سر نو تعمیر کیا تھا۔ علاوہ اُن عمارات کے جن کا ذکر میں کر چکا ہوں اور چند اور چھوٹی عمارتوں کے جن میں سے مزار مقدس[۱] بھی ہے بیت المقدس کی کل عمارتیں جدید ہیں۔ یورپ کی معاشرت کا اثر آج کل بہت بڑھ گیا ہے اور بتدریج اس شہر کی مشرقی صورت اور وضع کو زائل کر رہا ہے۔ شہر میں یافا کی راہ سے داخل ہوتے وقت مسافر کو سخت دھوکا ہوتا ہے۔ یورپ کی وضع کی عمارتیں خانقاہیں۔

[۱] مزار مقدس کے جنوبی برآمدے میں اس قسم کی محرابیں ہیں جو نقل ایسی محرابوں سے بہت مشابہ ہیں اور اس کی آرائش بھی اس قسم کی ہے کہ میں اس عمارت کو عربی عمارتوں میں یا اقلاً عربی طرز کی عمارتوں میں شمار کر سکتا ہوں۔ مصنف

شفاخانے فصیلیات وغیرہ اس کثرت سے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے شہر کے حوالی میں آگئے۔ بعض ہی مقامات ایسے ہیں علی الخصوص کوہ زیتون جن سے بیت المقدس کے گنبد اور مینار اور اونچے نیچے مکانات اور اُس کی دیواروں اور کنگرہ دار برجوں سے اس شہر کی پرانی شوکت نظر آتی ہے اس شہر میں پُرانی مذہبی یادگاریں اس کثرت سے ہیں کہ اُن زائرین کے لیئے جو دور دور کے ملکوں سے آتے ہیں ایک بہت ہی عظمت وحرمت کا باعث ہیں۔ جس وقت ہم مزار مقدس جبل زیتون۔ وادی قدرون۔ یہوشا فاط کی گھاٹی۔ مزار حضرت مریم عہ۔ قبرستان ملوک یہوذا۔ راہِ مقدس۔ کوہِ صہیون اور ان کے مثل اور مقدس مقامات کی جو اس شہر کے حوالی میں واقع ہیں زیارت کرتے ہیں تو اس وقت کیا کیا دیرینہ یادگاریں ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور ہمارے دلوں میں مذہبی اعتقادات کا جوش پیدا کرتی ہیں۔

رملہ کا بُرج اُن چھوٹی پرانی عمارتوں میں جنہیں عربوں نے شام میں چھوڑا ہے رملہ کا بُرج ہے جو یافا اور بیت المقدس کے بیچ میں ہے۔ عرب اسے چالیس اولیا کا بُرج کہتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ چالیس مسلمان اس کے نیچے مدفون ہیں۔ یہ بُرج ایک بہت عمدہ نمونہ عربی عمارت کا ہے۔ اس کی ساخت مربع ہے اور اس میں روشنی کے لیئے نوک دار روزن بنے ہوئے ہیں۔ اس کے اوپر چڑھنے کے لیئے ایک زینہ ہے جس میں ایک سو بیس سیڑھیاں ہیں اور باستثنا

اخیر سیڑھی کے سب بہت اچھی حالت میں ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ یہ برج صلیبیوں کا بنایا ہوا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کی تعمیر اُسی وضع کی ہے جو یورپ میں صلیبیوں کے ذریعہ سے رائج ہوئی تھی لیکن فی الواقع یہ عمارت عربی ہے اور اس کا ثبوت نہ فقط تعمیری باریکیوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے بلکہ اس میں ایک کتبہ بھی نہائت اچھی حالت میں موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر سات سو ہجری (۱۳۰۱ء) میں ہوئی تھی۔ اس کتبہ کی تصدیق ایک عرب مورخ نے کی ہے اور اس نے لکھا ہے کہ اسے سلطان قلاوون نے تعمیر کیا جس پتھر پر کتبہ ہے وہ اس طرح پر نصب کیا ہوا ہے کہ کبھی یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اسے تعمیر کے بعد نصب کیا ہو۔

عربوں کی یادگاریں دمشق میں

جہاں پر ہم نے اعراب جاہلیت کا ذکر کیا ہے وہاں اس امر کو دکھایا ہے کہ زمانہ تاریخی کی ابتدا میں دمشق ایک بہت بڑی تجارت گاہ تھا اور آں حضرت صلعم کے زمانہ سے بہت پہلے سے عرب اس شہر سے واقف تھے کیونکہ یہ منجملہ اُن شہروں کے تھا جہاں وہ اپنے ملک کی پیداوار فروخت کے لئے لاتے تھے۔ ان کے نزدیک تو حقیقت میں یہ مقام جنت تھا اور اس وقت بھی یہ شہر جیسا کہ آج مشہور ہے منجملہ دنیا کے سربرآوردہ شہروں کے تھا اور شہنشاہ جسٹینین نے اس کا نام آفتاب مشرق رکھ چھوڑا تھا۔ دمشق اس قدر بڑا مقام تھا کہ عربوں نے بجائے مدینہ منورہ کے اس کو

اسلام کا دار السلطنت قرار دیا اور بغداد کو یہ فخر بہت دنوں بعد حاصل ہوا جب تک دمشق خلفائے اسلام کا دار السلطنت رہا اور بہت دنوں اس کے بعد بھی یہ شہر ایک بہت بڑا مرکز تجارتی اور علمی اور حرفتی ترقی کا بنا رہا یہاں کا طبی مدرسہ اور رصد خانہ اور یہاں کے قصور شاہی تمام عالم میں مشہور و معروف تھے۔ یہ پرانا شہر جو اہرام مصر کا ہم عصر ہے اور جہاں اقوام اسیری و میڈ[۵] و مصری و ایرانی و یونانی و رومی و عرب و ترک نے یکے بعد دیگرے حکومت کی ہے اس وقت بھی صحیح و سلامت ہے لیکن متعدد فوجی حملوں اور آتش زنیوں نے تقریباً اس کی کل یادگاروں کو تلف اور برباد کر دیا ہے۔ اگرچہ عرب اس وقت یہاں حکومت نہیں کرتے لیکن ان کا مذہب ان کی زبان ان کا تمدن اس وقت بھی یہاں حکومت کر رہا ہے اور شائد دنیا کے تمام شہروں میں یہی ایک شہر ہے جس پر عربوں کا پورا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس وقت شام کے اور حصوں میں یورپ کے خیالات بہت کچھ سرائیت کر گئے ہیں لیکن دمشق جہاں اہل یورپ بہت ہی شاذ طور پر آتے ہیں ان خیالات سے بہت ہی بچا ہوا ہے۔ قاہرہ میں بھی جسے عربوں نے بنایا اور بہت صدیوں تک وہاں اُن کی حکومت رہی بمقابل دمشق کے ان کی یادگاریں بہت موجود ہیں

---

[۵] میڈیا ایک قدیم سلطنت تھی اس کے شمال میں بحر خزر اور آرمینیا تھا جنوب میں ایران اور مغرب کی طرف اسیریا یہ ایک نہایت زرخیز ملک تھا نینس اسیریا کے بادشاہ نے ۲۲۳۰ قبل مسیح میں اس ملک کو فتح کیا اور یہ ۸۷۸ قبل مسیح تک سلطنت اسیریا کا ایک صوبہ تھا۔ مترجم

لیکن اس شہر میں روز بروز یورپ کا رنگ آتا جاتا ہے اور اس وقت بھی اگر کسی سیاح کو یہ منظور ہے کہ مشرقی معاشرت کا معائنہ کرے اور تواریخ کے بلند ٹیلے پر چڑھ کر گذشتہ واقعات کی سیر دیکھے تو اُسے پھر دمشق ہی کو آنا پڑیگا۔

جب اس شہر پر دور سے نظر ڈالیں تو اس کے ہزار ہا میناروں اور گنبدوں کا ایک وسیع سبزہ زار میں سے نمودار ہونا بالکل پرستان کی سی کیفیت دکھاتا ہے اور سیاحوں کی ثناخوانیوں کی تصدیق کرتا ہے لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے تو قاہرہ کے قلعہ پر سے جو سیر نظر آتی ہے اُسے دمشق کا یہ منظر ہرگز نہیں پہنچتا۔ موسیو ڈیوڈ دمشق کا یوں بیان کرتے ہیں "جب کوئی سیاح دمشق میں داخل ہوتا ہے تو دور سے اُسے شہر ایک پرستان نظر آتا ہے۔ پیروں کے نیچے شہر کے محلے سرسبز باغوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ مکانات کے گرد انواع واقسام کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ شہر کے باہر ایک وسیع میدان ہے اور شہر کے اردگرد ایک عجیب وغریب فصیل ہے۔ یہ فصیل مثل یورپ کی فصیلوں کے دھندلی اور بدنما نہیں ہے بلکہ اس میں ایک حیرت انگیز چمک دمک پائی جاتی ہے۔ اس میں سیاہ اور زرد پتھر ملے جلے ہوئے ہیں بعض مدور بعض مربع اور بعض مثلث لیکن نہایت صنعت کے ساتھ بٹھائے گئے ہیں۔ یہ کنگرہ دار دیوار جیسا کہ کسی مشرقی شاعر نے کہا ہے گویا مخمل کی بنی ہوئی ہے اور اس میں بکھراج

جڑا ہے۔ شہر کے گرد یہی ایک فصیل نہیں ہے بلکہ اور بھی متعدد فصیلیں ہیں
جو شہر کے محلوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ ان میں سے
کسی کے تو مربع برج لطف دے رہے ہیں اور کسی کے عمامہ نما قبے
اپنا حسن دکھا رہے ہیں۔ لیکن یہ تو پہلی چیز ہے جو نظر میں آتی ہے آگے
چل کر اس سے بھی زیادہ عجیب سماں ہے۔ مکانوں درختوں اور
باغوں کی تعداد قریب قریب برابر ہے۔ ایک طرف تو سروں کی ایک
سیرگاہ بنی ہوئی ہے اور دوسری طرف اسلامی محرابوں کا لمبا دالان ہے
جسے بازار کہتے ہیں۔ ایک جھنڈ کھجوروں کا کسی مشہور فوارے کے
ارد گرد نظر آتا ہے کہیں امرا کے مکانوں کے اندر میوے کے درخت
دکھائی دیتے ہیں اور اس کے ساتھ کم سے کم ایک ہزار گنبد اور قبے
ہیں جن کی چوٹیوں پر تانبے کا ہلال چمک رہا ہے اور جن کی دونوں طرف
اونچے اور نکیلے مینار ہیں۔ ان پیچ در پیچ مکانات اور سطح بہ سطح باغات اور
درختوں پر آفتاب کی کرنیں جلوہ فگن ہوتی ہیں اور جب ان کا عکس نہر بردا
کے ساتھ کجدار شاخوں پر پڑتا ہے تو مختلف رنگوں کی آمیزش سے طلسمی
صورت نظر آنے لگتی ہے۔ یہی ہے دمشق جسے عرب الشام کہا کرتے تھے
یعنے انہوں نے تمام ملک کا نام اس اکیلے شہر کو دے دیا تھا۔"

اندر داخل ہونے پر شہر ایک یورپین کی نظر میں پہلے زیادہ نہیں
جچتا کیونکہ دمشق ہمیشہ سے عربوں ہی کے خیال میں سرتاج مشرق رہا ہے
تنگ اور پیچیدہ شاہراہیں جن کے دونوں طرف کچی دیواروں اور ڈھوپس گئے

مکانات اس پر گرد اس شدت سے اُڑتی ہے جس سے آنکھیں اندھی ہوئی جاتی ہیں، اور جس کا ٹھیک اندازہ بغیر دیکھے نہیں ہوسکتا وہ چیزیں ہیں جو پہلے پہل ایک بُرا اثر پیدا کرتی ہیں اور یہ اثر ایک زمانہ دراز کی عادت کے بعد دفع ہوتا ہے۔ دمشق کی تجارت کل ممالک مشرقی کے ساتھ اس کثرت سے ہے کہ اس شہر میں ہمیشہ بڑی چہل پہل رہتی ہے لیکن یہاں کی معاشرت میں مشرق کا ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے۔ بغداد کی طرف سے جو کاروان آتے ہیں وہ یہاں ایران اور ہندوستان کی پیداوار لاتے ہیں اور یہاں سے ریشمی اور دوسری قسم کا کپڑا اور دباغت کیا ہوا عمدہ چمڑا اور تانبے کے برتن جن پر چاندی کا کام بنا ہوا ہے لیجاتے ہیں۔

میں پھر کہونگا کہ اگر سچی اور صحیح مشرقی معاشرت مع اس کی تمام رنگ آمیزیوں کے دیکھنی ہے تو دمشق ہی کو دیکھنا چاہیئے۔ اس شہر کی پُرانی شاہراہیں اور قدیم بازار نہائیت درجہ دلچسپ ہیں۔ یہاں انسان ایک ہی وقت میں مشرق کی تمام مختلف اقوام کو دیکھ سکتا ہے۔ ایرانی سمور کی ٹوپیاں رکھے ہوئے اور پیش قبض کمر میں لگائے ہوئے۔ شامی دھاریدار لمبی عبائیں پہنے ہوئے اور ان کے سر پر کسا دا بالوں کی رسی کا بندھا ہوا دمشقی سیاہ اور زرد ریشم کی قبائیں زیب تن کئے ہوئے کمریں بندھی ہوئی اور رومی ٹوپی یا سفید عمامہ سر پر۔ ترکی سپاہی تیغے باندھے ہوئے حجاج مکہ نہائیت بے باکی کے ساتھ پھٹے کپڑے پہنے ہوئے

قونصلوں کے ملازم جن کی نیلی وردیاں کلابتون سے لسی ہوئی ہاتھوں میں
دُرّے لئے ہوئے۔ ترکی ملازم نظامت کی سرخ وردیاں پہنے ہوئے
دروز سوار شجاعت کے نشے میں چور کمر میں ہتھیاروں سے سجے ہوئے
عمدہ گھوڑوں پر سوار جن کے چمڑے کے زینوں پر سنہری روپہلی
کام آفتاب میں چمکتا ہوا۔ اونٹوں کی لمبی قطاریں جو کربان اور اناطولیہ اور
فرات کے کنارہ سے آرہی ہیں تجارت کے مال سے لدی ہوئی۔ کُرد
بدوی۔ ارمنی۔ مارونی۔ یہود۔ الجزائری۔ یونانی ان کے جھنڈ کے جھنڈ
اور ان کے مختلف لباسوں کی رنگ آمیزیاں بالکل کہکشان کا سماں دکھاتی
ہیں۔ ان کے چہروں کے رنگ سفید اور ارغوانی سے لے کر آبنوس کی
سیاہی تک کے کل مدارج میں نظر آتے ہیں۔

جس وقت میں ایک قہوہ خانہ میں بیٹھا ہوا اپنے حقہ کے دھویں
کے پردہ میں اس مختلف الالوان سماں کو دیکھ رہا تھا تو مجھے یہ معلوم
ہوتا تھا کہ کسی ساحر نے اپنے سحر کے زور سے کل مری ہوئی قدیم مشرقی
اقوام کو زندہ کر کے دکھا دیا ہے۔ اسلامبول میں بھی اس پل پر جو غلاطہ
تک چلا گیا ہے اسی قسم کی سیر نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں یورپ
کے رنگ کی آمیزش روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ وہاں بھی ایک
مجمع تمام عالم کا نظر سے گذرتا ہے۔ لیکن اس میں مشرق کا زیادہ لطف
نہیں آتا۔

سیاح جسے نقش ونگار یا مصوری کا شوق ہو دمشق میں یوں قیام کر سکتا ہے

عمارات قدیمہ کی باقیات الصالحات جو یہاں نظر آتی ہیں اس کثرت سے ہیں کہ اُن کے بیان کے لئے ایک علیحدہ کتاب درکار ہے۔ لیکن یہ کھنڈر بھی روز بروز برباد ہوتے جاتے ہیں اور چند روز میں تو بالکل مفقود ہو جائینگے۔ میدان کے محلہ میں اس شاہراہ پر جو مکہ کو گئی ہے ہر قدم پر منہدم مساجد۔ فوارے اور انواع و اقسام کی یادگاریں نظر آتی ہیں جن پر دو تین سو برس سے زیادہ نہیں گزرے لیکن جو اندرونی آرائشوں اور گلکاریوں کی وجہ سے جن میں ایرانی قلم نمایاں ہے اب بھی عربوں کی یادگاریں ہیں۔

اسی دمشق میں وہ قصر نظر آتے ہیں جو خاص عربی وضع پر تعمیر ہوئے ہیں اور میرے نزدیک مذاق اور آرائش کے لحاظ سے یوروپ کی عمدہ ترین عمارتوں سے بھی بہتر ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ بھی اسی عام قانون فطرت کے پابند ہیں اور ایک روز مفقود ہو جائینگے۔

جامع دمشق | یہ مسجد پہلے بت پرستوں کا مندر تھا اور پھر عیسائیوں کا کلیسا بنا اور اس کا پرانا حصہ اوائل سنین ہجری میں تعمیر ہوا تھا۔ ۱۰۶۹ء (۴۶۱ھ) میں یہ مسجد جل گئی تھی اور پھر دوبارہ تعمیر کی گئی اپنی اس موجودہ حالت میں یہ مسجد بہت ہی کم درجہ میں ہے بلکہ قاہرہ کی مساجد سے بھی گھٹی ہوئی ہے۔

جامع دمشق کا نقشہ بھی بجنسہ ویسا ہی ہے جیسا اور مساجد اسلام کا یعنے ایک بڑی مستطیل عمارت محرابوں پر ہے جس کی ایک جانب نماز

پڑھنے کی جگہ ہے اور چاروں کونوں پر مینار ہیں۔

مورخین عرب نے لکھا ہے کہ اس مسجد کی دیواروں میں اجارہ تک نہائیت بیش بہا سنگ مرمر لگا ہوا تھا اور اوپر کی طرف اور گنبد میں پتھر کی پچی کاری تھی۔ اس کی چھت سنہری تختوں کی تھی اور چھ سو طلائی چراغ اس میں آویزاں تھے۔ نماز کے مصلوں میں بیش بہا پتھر جڑے ہوئے تھے۔

اس آرائش کا بہت بڑا حصہ بالکل ضائع ہو گیا ہے۔ اس وقت دیواریں خوش خط کتبوں سے پر ہیں اور کھڑکیوں میں رنگین شیشے لگے ہوئے ہیں۔ بعض مقامات پر البتہ پرانی پچی کاری اس وقت تک باقی ہے۔ اس مسجد میں تین مینار ہیں۔ دو ان میں سے مکعب ہیں اور تیسرا جو نہائیت خوبصورت ہے مثمن پہل اور اس کے اوپر کے حصے میں ایک کٹہرا ہے۔ اسی مینار کی چوٹی پر ایک گولا ہے اور اس پر ہلال اسلامی بنا ہوا ہے۔ ان تینوں میناروں میں وہ مینار جو منارة العروس کے نام سے مشہور ہے نہائیت ہی پرانا خیال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر اوائل سنین ہجری میں ہوئی تھی۔ دوسرے مکعب مینار کو منارہ عیسے کہتے ہیں کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن حضرت عیسے ع اسی پر سے نازل ہونگے۔

اس مختصر بیان سے جو اوپر لکھا گیا ثابت ہوتا ہے کہ عربوں نے ابتدائے فتوحات اسلام ہی سے (اور اس خاص امر میں وہ اپنے

مابعد کے ملک گیروں سے بالکل علیحدہ ہیں اکل اُن عمارات کی جوان سے پہلے موجود تھیں نہایت قدر کی اور جس تمدن کو اُنہوں نے ان مفتوحہ ممالک میں پایا اسے ہمیشہ قایم رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کی شروع میں تو وہ بالکل جاہل تھے لیکن چندروز میں اپنے اساتذہ پر فوق لے گئے فن حرب اور محاصرہ کے وقت آلاتِ جنگ کا استعمال کرنا جو خاص حصہ یونانیوں کا تھا وہ بالکل نہیں جانتے تھے لیکن اسے بھی انہوں نے بہت جلد سیکھ لیا اور چندہی روز میں وہ اپنے مخالفین کے ہمسر ہو گئے۔ علوم و فنون ان میں بالکل ابتدائی حالت میں تھے لیکن ان متعدد مدارس کی بدولت جو انہوں نے قایم کئے وہ چندروز میں متقدمین کے نہ فقط برابر ہو گئے بلکہ ان سے بھی بڑھ گئے۔ فن تعمیر میں ان کی معلومات کچھ نہ تھیں لیکن انہوں نے مشرقی اور ایرانی معماروں سے کام لیا۔ اور اپنے خیالات اور مذاق کے مطابق ان کی طرز تعمیر میں اس قدر ترمیم کی کہ اس میں ان غیر قوموں کا حصہ مطلق باقی نہ رہا اور اس نے بطور خود ایک خاص وضع اور صورت پکڑ لی۔

مصر کی عربی عمارتیں

مصر ہی ایک ملک ہے جہاں اسلام کے ہر زمانہ کی عمارات موجود ہیں جن کے دیکھنے سے وہ تغیر جو بہ مرور زمان فن تعمیر میں ہوا معلوم ہو سکتا ہے۔

تقریباً عربوں کی کل قدیم عمارتیں جو اس وقت تک موجود ہیں مساجد ہیں اور چونکہ ان میں سے کل مشہور مساجد قاہرہ میں واقع ہوئی ہیں ان پر نظر ڈالنا آسان ہے۔

خود شہر قاہرہ اقلاً اس کا وہ حصہ جو یورپ کے تسلط سے بچا ہوا ہے بالکل الگ ہے اور اس سے بہت ٹھیک اندازہ زمانہ خلفا میں شہر کی حالت کا ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ اس درجہ مشرقی دکھائی دیتا ہے کہ کوئی دوسرا شہر اس خصوصیت میں اسے نہیں پہنچتا۔ یہ ایک مجموعہ ہے سفید مکانات کا جن کی چھتیں مسطح ہیں اور جن میں جابجا اونچے اونچے مینار کھجور کے درختوں میں سے سر نکالے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قلعہ کے اوپر سے اس شہر کا منظر بالکل پرستان کا سا ہے اور میں نے کوئی شہر نہیں دیکھا جس کا سماں اس قدر دلچسپ ہو۔

قاہرہ کی شاہ راہیں مثل اور مشرقی شہروں کے تنگ بے ترتیب اور پیچدار ہیں۔ محض محلوں میں علی الخصوص پرانے شہر میں مکانوں کے چھجے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ان تنگ گلیوں کا فائدہ یہ ہے کہ یہ رستہ کو دھوپ سے بچاتی ہیں اور ان میں ایک قسم کی خنکی اور تازگی دن بھر رہتی ہے۔ اس وقت قاہرہ میں جو بڑی بڑی سڑکیں اور سیرگاہیں یورپ کے مذاق کے بموجب بنائی گئی ہیں ان پر اگر کوئی شخص مصر کی دھوپ میں پیدل پھرے تو اُسے

معلوم ہوگا کہ وہ پرانی تنگ اور پتلی گلیاں اِن تپتی ہوئی شاہ راہوں سے کس قدر زیادہ پسندیدہ ہیں۔

قاہرہ کی شاہ راہوں کی چہل پہل ہر ایک سیاح کو تعجب میں ڈالتی ہے جس کسی نے دمشق کو دیکھا ہو اس کے لیے بھی یہ کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ اور میں نے اس کی سیر دیکھنے میں گھنٹوں وقت صرف کیا ہے۔

ڈاکٹر ازام میر لکھتے ہیں " کہ اس چیقلش کے اندر ایک طرف تو بچارہ فلاح نظر آتا ہے۔ دوسری طرف صحرائی بدوی تیز قدمی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ادھر قبطی یا یہودی روکھی صورت بنائے ہوئے ایک دھن میں قدمزن ہے۔ دوسری طرف چیست اور چوکنا یونانی آرہا ہے۔ قونصلوں کے ملازم خاموش اور مغرور حبشیوں کے کل مدارج آبنوس رنگ سودانی سے لے کر سانولے بربریوں تک سب قسم کی مخلوق نظر آتی ہے۔

عربستان اور افریقیہ کے ہر مقام سے کارروان آرہے ہیں کہیں لدے ہوئے اونٹ گم سم کھڑے ہیں۔ کہیں گدھے ہلکے پھلکے اور چالاک مشرقی تاجروں یا برقع پوش عورتوں کو پیٹھ پر لیئے دوڑتے چلے جارہے ہیں۔ ایک طرف سے کوئی پاشا نظامت کی چست زردی پہنے گھوڑے پر سوار قدم قدم آرہا ہے۔ بہشتی مشکیں لیئے ہوئے۔ ہر قسم کے حمال۔ سائیس

ہٹو بچو کہتے ہوئے سُست راہ گیروں یہاں تک کہ عورتوں کو بھی جو راستہ نہ دیں چابک سے ہٹاتے ہوئے۔ یہ ایک ایسا سماں ہے جو ہر وقت نیا ہے اور جس سے دیکھنے والوں کو سیری ہی نہیں ہوتی۔

اصلی شہر قاہرہ ۳۵۹ھ ہجری (۹۷۰ء) میں تعمیر ہوا۔ اس کی فصیل کے اندر وہ پرانا قصبہ فسطاط کا تھا جسے عمرو نے بنا کیا تھا اور جس کی جگہ یہ نیا شہر قائم ہونے والا تھا۔

نئے شہر کا نام القاہرہ یعنے فتح مند رکھا گیا ہے اور اسے اہل یورپ کایرو کہتے ہیں۔ فسطاط اب قاہرہ کا ایک محلہ ہے اور اسے پرانا شہر کہنا محض غلطی ہے کیونکہ وہ کبھی اس نام سے نہیں پکارا جاتا تھا۔

بنیاد رکھنے سے تین سال کے اندر یہ نیا شہر تمام ہوا اور خلفائے بنی فاطمہ نے اپنے مداخل کا ایک بہت بڑا حصہ اس کی آرائش میں صرف کیا۔ ہر ایک خلیفہ نے خلفائے ماسبق سے بڑھ جانا چاہا یہاں تک کہ مملوکین نے بھی جب وہ خلیفہ کی جگہ پر حکمران ہوئے شہر کی آراستگی کو اپنا فخر سمجھا۔ اس وقت البتہ جب کہ مصر ایک ترکی صوبہ ہو گیا قاہرہ کی آرائش نہ فقط موقوف ہو گئی بلکہ گھٹنے لگی ہے۔ اس وقت کل بڑی بڑی عمارتیں روز بروز برباد ہوتی جاتی ہیں اور چونکہ اُن میں کسی قسم کی بھی مرمت نہیں ہوتی غالباً بہت تھوڑے زمانہ میں وہ بالکل نیست و نابود ہو جائینگی۔ مصر کے ایک بڑے شخص نے مجھ سے قاہرہ میں کہا کہ خوب ہوا تم ان عمارتوں کے دیکھنے کے لئے آئے ہو کیونکہ چند روز میں کوئی چیز دیکھنے کے قابل

باقی نہ رہیگی۔

اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ بہ ترتیب تاریخی قاہرہ کی بڑی عمارتوں کا بیان کرینگے۔ منجملہ چار پانسو مساجد کے جو اس شہر میں ہیں ہم نے انہی کو انتخاب کیا ہے جن سے ہر ایک زمانہ کی طرز تعمیر ابتدائے بنیاد قاہرہ سے لے کر اس وقت تک ظاہر ہوتی ہے۔

مسجد عمرؓ

سنہ ۲۱ ہجری (۶۴۲ء) عمرؓ کی مسجد سب سے زیادہ قدیم اور اسلام کی سب سے زیادہ متبرک عبادت گاہ ہے کیونکہ صحابی رسول صلعم نے اس کی تعمیر میں ہاتھ لگایا ہے۔

چونکہ اسے عمرؓ فاتح مصر نے تعمیر کیا تھا یہ آج تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے چار خلفاء کے عہد تک بلکہ آخر حکومت بنی اُمیہ تک قاہرہ میں یہی ایک مسجد تھی اور چونکہ اس کی طرز پرانی مساجد کی سی تھی بہت دنوں تک قاہرہ کی مساجد اسی نمونہ پر بنتی رہیں۔

اس کا نقشہ نہایت ہی سادہ ہے اور جب ہم ایک پرانی مسجد کو اچھی طرح دیکھ لیں تو اور سب کا نقشہ بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ مسجد عمرؓ میں ایک بڑا مستطیل صحن اور تینوں ضلعوں پر لمبے لمبے دالان ستونوں پر ایستادہ ہیں۔ چوتھے ضلع پر تینوں ضلعوں سے زیادہ گہری عمارت ہے جو نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ صحن کے وسط میں ہمیشہ ایک حوض وضو کے لئے ہوا کرتا ہے اور کونوں پر حسبِ بنا کم و بیش اونچے نیچے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

اکثر قدیم مساجد کے سامنے ایک صحن ہوتا ہے جس کے گرد مسافروں کے اترنے کے حجرے اونٹوں اور گھوڑوں کے باندھنے کے طویلے۔ جانوروں کو پانی پلانے کے حوض اور حمام ہوا کرتے ہیں۔ قدیم مساجد نہ فقط عبادت گاہیں تھیں بلکہ مسافروں کے اُترنے کی سرائیں بھی تھیں۔

اس مسجد عمرؓ کے ستون مختلف یونانی اور رومی عمارتوں سے لئے گئے ہیں ان کے اوپر محرابیں ہیں جو مثل قدیم محرابوں کے سادی ڈانٹھ کی ہیں۔ یعنے اوپر کو بہت کم نوکدار ہیں اور نیچے کی طرف ان میں نعل اسپ کی صورت بہت ہی خفیف سی ہے۔ آگے چل کر جب یہ محراب اوپر کو زیادہ نوکدار ہو گئی اور نیچے سے پھیل گئی اس وقت اس میں خاص عربی طرز پیدا ہو گئی۔ یہ نعل اسپی صورت کی محرابیں جب کسی گنبد کے سامنے لگائی جائیں تو گویا اسے نازک اور خوشنما بنا دیتی ہیں اور مشرقی طرز تعمیر کے مدور گنبدوں سے جو نیچے سے دبے ہوئے تھے بہت بڑھا دیتی ہیں

مسجد عمرؓ کے صحن کے گرد جو عمارتیں تھیں ان میں سے دو ہی طرف رہ گئی ہیں۔ ایک جانب کے تو ستونوں کی ایک ہی قطار رہ گئی ہے اور دوسری جانب جدھر مصلے ہے چھ قطاریں باقی ہیں۔ چونکہ ان دالانوں میں اکیس اکیس محرابیں ہیں لہذا ستونوں کی کل تعداد ایک سو چھبیس ہے لیکن پہلی قطار میں دُہرے ستون ہیں پس جس قدر ستون اس وقت موجود ہیں ان کی مجموعی تعداد ایک سو سینتالیس ہے۔

مصلے کے بیچ میں جیسا کہ بلا استثنا ہر مسجد میں ہوتا ہے ایک طاقچہ نما

جس پر محراب بنی ہوئی ہے اور اس کا رخ مکہ معظمہ کی طرف ہے جو تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ اسی کے ایک طرف کو منبر ہوا کرتا ہے۔ مسجد عمرؓ میں یہ دونوں چیزیں نہائت سادہ وضع کی ہیں۔

اس مسجد کے مینار بھی بہت ہی سادہ ہیں یعنے بہت زیادہ اونچے نہیں ہیں اور ان میں ایک ہی کٹھرا ہے اور اوپر سے یہ مخروطی ہیں۔ مسجد عمرؓ میں نہ نسخی کلگاریاں ہیں نہ عربی آرائشیں اور نہ وہ پھول بوٹے جن کو عربوں نے اخیر میں ایجاد کیا۔ باوجود سادگی کے اس مسجد کے ستون اور محرابیں میری نظروں میں نہائت ہی شاندار معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ یہ قدیم عمارت بھی مثل اور قدیم مساجد مصر کے برباد ہو رہی ہے[۵]۔

مسجد طولون (۲۶۳ھ ہجری یعنے ۸۷۶ء)	طولون کی مسجد بھی نہائت سادہ وضع

[۵] جن مصنفین نے قاہرہ کا بیان لکھا ہے وہ اکثر مورخین عرب کے بیان کے بموجب لکھتے ہیں کہ "اس مسجد میں ہر رات کو اٹھارہ ہزار چراغ روشن ہوتے تھے اور ان میں روزانہ پندرہ ہزار چار سو من خالص تیل جلتا تھا" محقق مورخ نے جن میں "بالی سیر" بھی شامل ہے اس قول کا اعادہ کیا ہے۔ لیکن ایک معمولی حساب کی رو سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس بیان کے بموجب فی چراغ چونتیس سیر دو چھٹانک تیل پڑتا ہے جو بالکل خلاف قیاس ہے علاوہ اس کے پندرہ ہزار چار سو من تیل کو روزانہ مسجد تک پہنچانے کے لیے اونٹوں کی قطار کی قطار درکار ہے۔ مصنف۔

کی ہے لیکن عمر کی مسجد سے جس کا ذکر اوپر ہو چکا زیادہ آراستہ ہے۔ اس کا نقشہ وہی ہے جو عمر کی مسجد کا ہے یعنے بیچ میں ایک مربع صحن ہے اور اس کے دونوں جانب دو دالان محرابوں پر۔ یہ محرابیں بالکل نوکدار ہیں اور ان کے نیچے کا حصہ زیادہ تر نعل کی صورت ہے۔ یہ محرابیں بعوض معمولی ستونوں پر قائم ہونے کے پایہ دار ستون پر قایم ہیں جن کے چاروں کونوں پر ایک ایک ستون ہے۔ ان ستونوں کا اوپر والا حصہ شرقی وضع کا ہے۔ یہ وضع پایہ دار ستونوں اور پایہ کے کونوں پہ چار ستونوں کی ظاہرا اس طرز عمارت کی اصل معلوم ہوتی ہے جس میں محراب کے نیچے کئی ملے ہوئے ستون رکھے جاتے تھے اذرگاتھک کلیسوں میں اس قدر عام ہیں محرابوں کے اوپر کی چھت مسجد عمر کی چھت کی طرح بنی ہوئی ہے۔

مسجد طولون میں بھی نہ نسخی آرائشیں ہیں نہ قلم کاریاں۔ پھول پتے جو گچ کے نیچے کھڑکیوں کے آس پاس اور محرابوں کے اوپر بنے ہوئے ہیں وہ طرز مشرقی کو یاد دلاتے ہیں۔ لیکن ان میں نسخی صورت پیدا ہو چلی ہے۔ چھت کے نیچے نیچے کوفی کتبے ہیں جو لکڑی میں کھدے ہوئے ہیں۔ مسجد کی باہر کی دیوار کنگرہ دار ہے۔

یہ عمارت پکی اینٹوں کی بنی ہوئی اور اس پر گچ کاری کی ہوئی ہے آرائشیں اور نقش و نگار گچ ہی سے بنے ہوئے ہیں۔ میناروں میں سے کل ایک باقی رہ گیا ہے۔ یہ مینار کئی درجوں میں ہے او نیچے سے مربع بیچ میں مدور او اوپر مشت پہل ہے۔

صحن مسجد کے بیچ میں ایک خوبصورت سا پٹا ہوا فوارہ ہے۔ اس کے دروازہ پر کھڑکیاں ہیں جن کے اوپر کا حصہ مثلث ہے۔

طولون کی مسجد بالکل ویران ہے۔ مصر کی حکومت نے اس پرانی یادگار کے ساتھ بھی وہی مہربانی کی ہے جو اور پرانی یادگاروں کے ساتھ دیواریں سب گر رہی ہیں اور چند سال میں اس مسجد کی جگہ محض ایک تودۂ خاک رہ جائیگا۔ اس کے دیکھنے کے لئے مجھے ایک دروازہ کو توڑنا پڑا جس میں اس غرض سے قفل پڑا ہوا تھا۔ کہ کوئی اندر نہ جاسکے۔

جامع ازہر (۳۵۹ھ / ۹۶۹ء) بلحاظ آرائش کے طولون کی مسجد سے کئی درجہ بڑھی ہوئی ہے لیکن اسے دیکھتے وقت یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی آرائشوں کا بہت بڑا حصہ اس کی تعمیر سے کہیں مابعد کا ہے۔ بوجہ اس مدرسہ کے جو اس میں ۳۶۱ھ ہجری سے قایم ہے یہ مسجد کل مساجد اسلام میں نہایت مشہور رہی ہے اور اس وقت بھی اس کی شہرت دور دور تک ہے اور اس میں بلاد اسلامیہ کے کل اقطار سے طالب العلم آتے ہیں فی الواقع یہ مسجد مشرقی علوم عربیہ کا اخیر مسکن وموطن ہے۔ اساتذہ جو اس مسجد کے اوقاف سے تنخواہ پاتے ہیں طبعیات و ہندسہ و تاریخ میں درس دیتے ہیں۔ اگلے زمانہ میں اس مدرسہ کے طلاب کی تعداد بارہ ہزار تھی اور اس وقت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ جو طلاب نہایت ہی مفلس ہیں ان کی کل حوایج کی کفالت کی جاتی ہے۔ اس مسجد کا نقشہ بھی

ویسا ہی ہے جیسا مسبوق الذکر مساجد کا۔ فرق اسی قدر ہے کہ اس کے ارد گرد حجرے بنے ہوئے ہیں جن کے سبب سے اس کے نقشہ میں کسی قدر تغیر آگیا ہے۔

اس کی ابتدائی طرز عمارت کا درست اندازہ کرنے کے لئے مسجد کے بڑے صحن کو دیکھنا چاہئے۔ اس کی محرابیں تین سو اسی سنگ سماق اور سنگ مرمر اور سنگ صوان کے ستونوں پر قائم ہیں لیکن ان ستونوں کے اوپر اور نیچے کے حصے مشہور و معروف عمارتوں میں سے لئے گئے ہیں محرابیں بمقابل مسبوق الذکر مساجد کے بہت زیادہ نوکدار ہیں۔ اس مسجد کے مینار بہت عجیب ہیں لیکن یہ مسجد کی تعمیر سے بہت بعد کے بنے ہوئے ہیں

مسجد قلادون ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء

یہ مسجد اس زمانہ کی صنعت عربی کا نمونہ ہے جب کہ وہ اپنی ترقی کے اعلےٰ درجہ کو پہنچ چکی تھی اور نہائت افسوس ہے کہ اس کی بعض دیواروں اور چھتوں کے رنگ جدید تعمیر اور مرمت کے وقت بالکل خراب کر دئے گئے۔

اس مسجد کی بیرونی شان بالکل قدیم گاتھک عمارتوں کی معلوم ہوتی ہے کاسٹ سے لے کر ایبرس تک کل سیاحوں نے اس مشابہت کا تذکرہ کیا ہے ایبرس لکھتا ہے " اس مسجد کی محرابوں اور اس دالان میں جہاں قلادون کی قبر ہے زیادہ تر عجیب امر یہ ہے کہ اس کی ظاہری صورت بالکل ہمارے گاتھک کلیسوں کی سی ہے محرابوں کی لمبی قطار کے اندر چھوٹی محرابیں ستونوں پر ٹکی ہوئی ہیں۔ چھت کے نیچے گنبد مطلق نہیں ہے اور ستونوں میں اوپر کا حصہ

مفقود ہے۔ بیچ کے دروازے کے سامنے سائبان ہے جو بہت سی محرابوں سے بنا ہوا ہے اور یہ محرابیں مختلف اونچائی کے ستونوں پر قائم ہیں۔ یہ مجموعی ہیئت جس میں کسی قسم کا انتظام یا تناسب اجزا نہیں رکھا گیا ہے بجنسہ ویسی ہی ہے جیسی کہ فرانس جرمنی اور شمالی اطالیہ کے اسی زمانہ کی عمارتوں کی ہوا کرتی تھی۔

فی الواقع اگر اس عربی عمارت میں وہ چیزیں بڑھا دی جائیں جن کی ضرورت ایک سرد اور زیادہ بارش والے ملک میں ہے اور نیز وہ چیزیں جو مذہب کی رو سے ضرور ہیں اور وہ جن کو بت تراشی کے فن نے جائز رکھا ہے یعنے اونچی چھتیں نکیلے پا کھے۔ لمبے پرنالے۔ گھنٹے لٹکانے کے برج۔ مورتیں اور ابھری ہوئی تصاویر تو یہ بیشک ایک نصرانی عمارت سے جو شمال میں بنی ہو متبدل ہو جائیگی۔

"یہ وضع عمارت یقینی وہ ہوگی جسے ہم گاتھک کہتے ہیں اور جس کی ایک عمدہ مثال پیرس کا سینٹ شاپل[1] ہے اور ان دونوں عمارتوں کی وضع تعمیر تیرھویں صدی عیسوی کی ہے۔

مسجد قلادون میں ایک گنبد والا دالان ہے جس میں بانی مسجد کی قبر ہے۔ یہ بہت ہی خوبصورت دالان ہے۔ اور اس کی محرابیں پایہ دار ستونوں پر قائم ہیں جن کے کونوں پر مرصع کار ستون ہیں۔ اس کی نکیلی

[1] یہ ازمنہ متوسط کی ایک بہت مشہور عمارت ہے اور اسے سینٹ لوئی پادشاہ فرانس نے ۱۲۴۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔ مترجم

کھڑکیاں بھی ہمیں گاتھک طرز کو یاد دلاتی ہیں۔ کسی زمانہ میں اس مسجد کے متعلق ایک شفاخانہ بھی تھا۔ اگرچہ اس مسجد کا بیان ایک حال کی سفر مشرق کی کتاب میں لکھا ہے لیکن فی الواقع اب اس کا وجود نہیں رہا۔

مسجد حسن ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء

اب ہم بتدریج اس زمانہ تک پہنچ گئے جو عربی تعمیر کے زیادہ سے زیادہ عروج کا زمانہ ہے اور اس طرز نے مسجد حسن میں جو قاہرہ کی عمدہ ترین عمارات میں سے ہے اعلیٰ شگفتگی پیدا کی ہے۔

اس مسجد کی وسعت دیکھ کر ہمیں اپنے بڑے کلیسے یاد آتے ہیں۔ وسعت میں یہ پیارس کے نوتر دام سے بڑی ہے۔ اس کے بڑے گنبد کی بلندی ساٹھ گز ہے اور اس کے مینار ۹۴ گز اونچے ہیں جو دانذوم کے مینار کی دونی اونچائی ہے۔ عمارت کا طول ایک سو ترپن گز اور عرض بیاسی گز اور دیواروں کا آثار ساڑھے آٹھ گز ہے۔ پرانی مساجد کی دیواروں کی طرح یہ اینٹ اور سنگ مرمر سے نہیں بنی ہیں بلکہ ان میں ترشے ہوئے پتھر لگائے گئے ہیں۔

اس عمارت کی مجموعی شان ویسی ہی ہے جیسے ہندوستان کی اُن بڑی مساجد کی جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ مسجد حسن کا نقشہ معمولی نقشہ سے کسی قدر مختلف ہے۔ بعوض مربع یا مستطیل ہونے کے اس کی ساخت شکل یونانی صلیب کے ہے محرابدار دالانوں کے بدلے جیسا کہ مسبوق الذکر مساجد میں دیکھا گیا بیچ کے دالان کے دونوں طرف اور دو بڑے دالان ہیں جن کے اور بیچ والے دالان کے درمیان میں بہت ہی اونچی نوکدار

محرابیں ہیں۔ ان میں سے جو سب سے بڑا دالان ہے اسمیں مصلیٰ ہے جس کی محراب تئیس گز اونچی ہے۔ اس مصلے کے پاس ہی منبر ہے۔ جو ہر مسجد میں ہوتا ہے۔ دیواروں پر سنگی آرائشیں اور کتبے ہیں۔ صحن مسجد کے وسط میں ایک بہت ہی شاندار فوارہ ہے لیکن افسوس کہ شکستہ حالت میں ہے۔ اس مسجد میں بانی مسجد کی قبر بھی ہے اور یہ ایک گنبد والے دالان میں ہے جس کا قطر تئیس گز ہے اور اس کے نیچے ایک حاشیہ قلمکار پھول بوٹوں کا بنا ہوا ہے۔ اس دالان کے چاروں طرف بہت ہی خوبصورت کتبہ لکڑی میں کھدا ہوا ہے جس کی چوڑائی ایک گز سے زیادہ ہے۔

اس مسجد میں بھی مثل مساجد فوق الذکر کے محرابیں نیچے کو کسی قدر کھچی ہوئی ہیں لیکن کم۔ سچ یہ ہے کہ پوری نعل اسپی شکل کی محراب کو عربوں نے سوائے اندلس کے اور کہیں زیادہ استعمال نہیں کیا۔

مسجد حسن کے سامنے کا دروازہ اکیس گز اونچا اور نیم دائرہ کی صورت ہے اور اس پر جو نیم گنبد ہے وہ پتھر کے قلمکار ستونوں پر کھڑا ہوا ہے۔ دیواروں پر عمدہ قسم کا سنگی نقش و نگار ہے۔

مسجد حسن کی بھی وہی حالت ہے جو اور مساجد قاہرہ کی۔ اس کی حفاظت میں بھی اسی قدر بے اعتنائی کی گئی ہے۔ جیسی اور مساجد کی حفاظت میں۔ گل پچی کاری کا کام۔ نقش و نگار۔ خاتم بندی برباد ہوگئی ہے اور غالباً چند سال میں اس عمارت عظیم الشان کی فقط دیواریں ہی

رہ جائیں گی۔

اس زمانہ کی کل مساجد حقیقت میں نہائت عمدہ ہیں اور یہ اور ان کے بعد کی صدی والی عمارتیں مصر کی اسلامی تعمیر کی اعلے درجہ کی مثالیں ہیں۔ میں اس عہد کی عمارتوں میں امیر اخور کی مسجد کا ذکر کرونگا جس کا گنبد نہائت ہی خوبصورت ہے۔ علاوہ اس مسجد کے عمارات ذیل بھی اس زمانہ کی ہیں

مقبرہ برقوق[1] سنہ ۷۸۴ھ ۱۳۸۴ع	یہ مقبرہ سفید اور سرخ پتھروں سے بنا ہے۔ جن کی تہیں یکے بعد دیگرے اور ایک خاص ترتیب سے

جمائی گئی ہیں۔

اس کا مینار اور مسجد قائت بلے[2] کا مینار اس قسم کی عمارتوں کی بہت عمدہ مثالوں میں ہے۔ اور ان میں عربی تعمیر کی بہت اعلے درجہ کی صنعت نظر آتی ہے۔ اس عمارت کے گنبد جو نیچے سے کسی قدر سمٹے ہوئے ہیں نہائت ہی خوبصورت ہیں۔

[1] الملک الظاہر ابو سعید برقوق خاندان چراکسہ کا پہلا بادشاہ اور اصل میں غلام تھا۔ سنہ ۷۸۴ھ میں تخت پر بیٹھا۔ سنہ ۷۹۱ ہجری میں یہ تخت پر سے اتار دیا گیا اور عبد الملک الصالح حاجی بادشاہ ہوا لیکن ایک سال کے اندر برقوق دوبارہ بادشاہ ہو گیا اور اپنی وفات یعنی سنہ ۸۰۱ھ تک سلطنت کرتا رہا۔ مترجم

[2] الملک الاشرف قایت بائے مصر کے خاندان چراکسہ میں ظاہر حقمق کا غلام تھا یہ سنہ ۸۷۲ھ میں بادشاہ ہوا اور اس نے سنہ ۹۰۱ھ تک سلطنت کی۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد خاندان چراکسہ کی سلطنت تمام ہو گئی۔ مترجم

مقبرہ برقوق کا گنبد اندر سے بھی نہائت ہی پُرتکلف ہے۔ اس مربع دالان کے چاروں کونوں پر جس پر یہ گنبد بنا ہوا ہے نہائت حسین قلم کار ستون ہیں۔ مقبرہ برقوق میں ایک نہائت پرتکلف منبر سنگ مرمر کا ہے اس کی پتھر کی جالیاں فی الواقع صنعت عربی کی اعلیٰ درجہ کے کام کا نمونہ ہیں اس شان کی عمارت کو منہدم ہونے دینا اور ہر ایک وارد و صادر کے ہاتھ سے اُسے بے حرمت کرانا ایک شدید وحشیانہ فعل ہے۔

مسجد المؤید[۱] ۸۱۸ھ / ۱۴۱۵ع — یہ مسجد مجموعی حیثیت سے مسبوق الذکر مساجد سے درجہ میں کم ہے کیونکہ اس میں اندرونی آرائش حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے لیکن آرائشوں کے لحاظ سے اسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ قاہرہ کی آراستہ ترین مساجد میں ہے۔ اس وقت یہ بالکل منہدم ہو گئی ہے اور مثل اس قسم کی اور عمارتوں کے غالباً یہ بھی ایک تو دہ خاک ہو جائیگی۔ میں نے اس مسجد میں نہائت پُرتکلف چھتیں مربع تختیوں کی جن پر پھول بوٹے رنگ امیزیاں اور طلائی کام بنا ہوا تھا اور جو آج کل قاہرہ میں نہائت ہی کمیاب ہیں دیکھی ہیں دروازوں کے آگے کے برآمدے ستونوں پر کھڑے ہیں اور ان کی محرابیں نوکدار اور نیچے کی طرف کسی قدر دبی ہوئی ہیں۔ کھڑکیاں بھی نوکدار اور کتبوں سے لسی ہوئی ہیں۔ صحن میں مختلف الالوان پتھروں کی پچی کاری ہے۔

[۱] الملک المؤید ابو النصر شیخ المحمودی۔ یہ بھی خاندان چراکہ میں سے اور الظاہر برقوق کا غلام تھا یہ ۸۱۵ھ میں بادشاہ ہوا اور اپنی وفات (۸۲۴ھ) تک سلطنت کرتا رہا۔ مترجم

مقبرہ قائیت بائے سنہ ۸۷۲ھ ۱۴۶۷ء

اس مقبرہ میں زیادہ تر دیکھنے کے قابل گنبد ہے جس کے اندر نہائیت عمدہ نسخی گل بوٹوں کی جالیاں منبت کام کی بنی ہوئی ہیں اور دوسرے اس کا تین درجوں والا مینار۔ اس مینار پر بے انتہا کندہ کیا ہوا ہے اور یہ گویا ترقی تعمیر عرب کا اخیر درجہ ہے۔ اس مینار کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے کس صناعی کے ساتھ پتھر کے چھجوں طاقچوں اور کٹہروں کو اس میں استعمال کیا ہے اور مینار کو دیوار سے بہت اونچا لے گئے ہیں جس سے اس میں بمقابل مربع یا مدور برج کے بہت زیادہ خوبصورتی آگئی ہے۔

مقبرہ قائیت بائے اور مقبرہ برقوق یہ دونوں منجملہ اُن عمارتوں کے ہیں جن کو عموماً مقابر خلفا کہتے ہیں۔ اکثر ان میں سے ملوکین چرکس کے زمانہ کے ہیں یہ سب ایک میدان میں قاہرہ کے سامنے بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کا مجموعی منظر اس قدر شاندار ہے کہ میں نے ایسا شاندار کوئی مقام نہیں دیکھا شہر کے دوسرے کنارہ پر قلعہ کی دیواروں کے نیچے ایک اور میدان ہے اور یہ بھی مقبروں سے بھرا ہوا ہے۔ غرض ہر قسم کے مینار اور مساجد اور گنبد یہاں نظر آتے ہیں۔ یہ عمارات مختلف زمانوں کی ہیں اور نہائیت دلچسپ ہیں۔

ترکوں کی مساجد قاہرہ میں

منجملہ ان چند مساجد اور قصروں کے جو نبرھویں صدی کی ابتدا سے یعنے ترکوں کے زمانہ تسلط سے تعمیر ہوئے ہیں میں کسی ایک کو بھی لائق بیان نہیں سمجھتا۔ ان میں سے بلحاظ وسعت کے

سب سے بڑی عمارت محمد علی کی مسجد ہے۔ اس کے دبے ہوئے گنبد اور پتلے پتلے مدور مینار جو برچھی کی طرح نوکدار ہیں اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ عربوں اور ترکوں کے صنعتی خیال میں کس قدر بعد المشرقین ہے۔ جس وقت عرب مصر میں آئے ہیں وہ بیشک پختہ کار صناع نہ تھے لیکن تاہم صنعت کا مذاق اور جوہر ان میں اعلےٰ درجہ کا تھا اور انہوں نے ان اجزا سے جو تعمیر مشرقی میں موجود تھے ایک بالکل ہی نئی طرز ترتیب دی۔ ترکوں کے لیئے اُستاد بھی موجود تھے اور نمونے بھی تھے۔ لیکن انہیں ان سے کام لینا کبھی نہ آیا۔ جب انہوں نے قاہرہ میں مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو انہیں بجز اس بدہئیت مسجد آیا صوفیہ کی طرز کے جو حقیقت میں شرقی عیسائیوں کا ایک پُرانا کلیسا تھا اور کوئی طرز پسند نہ آئی۔ یہ عمارت اس زمانہ کی صنعت کا نمونہ ہے جس سے عرب مدت ہوئی گذر چکے تھے لیکن ترکوں کو اس سے بہتر کوئی طرز آتی ہے اور نہ ان میں اس پر ترقی کرنے کا مادہ ہے۔

عربوں کی دوسری قسم کی یادگاریں قاہرہ میں

شہر کے دروازے۔ قلعہ چاہ یوسف وغیرہ منجملہ ان عمارتوں کے جو عہد خلفا کی ہیں اور جن سے عربی تعمیر کا اندازہ ہو سکتا ہے شہر کے دو دروازے یعنے باب النصر اور باب الفتوح ہیں جنہیں فاطمی خلیفہ مستنصر نے گیارھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا۔

قاہرہ کا قلعہ بھی ایک عمدہ عمارت ہے۔ اسے سلطان صلاح الدین نے

بارھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ اس قلعہ میں پانی ایک کوئیں کے ذریعہ سے آتا ہے جسے نہائت ہی صنعت کے ساتھ پتھر میں کھودا ہے اور جس سے اس زمانہ کے عرب مہندسین کی لیاقت کا اعلےٰ اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ کنؤاں عمق میں چھیانوے گز ہے اور اس کا منہ ساڑھے آٹھ گز مدور ہے۔ اس کنوئیں کے دو طبقے ہیں۔ پانی اس طرح نکالا جاتا ہے کہ ایک رسی میں مٹی کی ٹھلیاں بندھی ہوئی ہیں اور بیلوں کے ذریعہ سے رسا دور میں رہتا ہے پہلے درجہ تک اُترنے کے لئے کوئیں کے گرد ایک راستہ بنا ہوا ہے۔ جس کا اتار اس قدر خفیف ہے کہ بیلوں کو اترنے چڑھنے میں زیادہ دقت نہیں پڑتی۔

علاوہ مکانات کے تمدن عرب کی اور بہت سی اشیا سکنی، مکانات۔ ہتیار آلات۔ صنعت وغیرہ وغیرہ قاہرہ میں نظر آتی ہیں۔ جب ہم انہیں اُن عمارات کے ساتھ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ملائیں تو پورا اور صاف اندازہ اس تمدن کا ہو سکتا ہے جو پیروان دین اسلام نے مصر میں قایم کیا۔

شمالی افریقیہ کی عربی عمارتیں

عربوں کا تمدن افریقیہ میں ہرگز اُس عروج پر نہیں پہنچا جیسا مصر اور اندلس میں۔ تاہم افریقیہ میں بڑے بڑے شہر تھے اور ان میں بعض عمدہ عمارات بھی ہیں علی الخصوص اغلبیون کے زمانہ کی۔ انہوں نے قیروان تونس۔ فاس، کے سے شہروں کو جو اس وقت موجود تھے ترقی دی اور بعض کو

مثل تلمسان - الجزائر اور بجایہ وغیرہ کے قریوں سے شہر بنایا۔ لیکن ان کی شہرت بہت ہی چند روزہ تھی۔ بربریوں کی باہمی رقابت ان کی ضعیف تمدن پذیری بدویوں کا ملک پر چڑھائی کرنا اور بغداد اور قاہرہ کے سے ترقی کے مرکزوں کا نہ ہونا یہ اسباب تھے جو ان کے تمدن کے مانع ہوئے۔ شمالی افریقیہ میں ہمیں ایسی عربی پرتکلف عمارتوں کی بھی توقع نہ کرنی چاہئے جو مصر و اندلس میں پائی جاتی ہیں۔ ہم اپنی کتاب کے اس باب میں جہاں عربوں کی تعمیر کا ذکر ہے اس بات کو دکھائیں گے کہ افریقیہ میں وہ اپنے کو پوری طرح سے شرقی طرز تعمیر کی قید سے نہ چھڑا سکے۔ ہم یہاں مشہور عمارتوں کے ناموں پر اکتفا کرتے ہیں اور ان میں سے بھی جیسا ہم اب تک کرتے آئے ہیں منجملہ مذہبی عمارات کے اُن ہی کو لیں گے جو اس وقت تک کسی قدر باقی ہیں۔

مسجد قیروان | مسجد قیروان کا بانی وہ مشہور شخص عقبہ[1] تھا جس نے افریقیہ کو فتح کیا۔ اس نے ۵۵ھ (۶۷۵ء) میں ایک بہت بڑی مسجد تعمیر کی جو دوبارہ اور کئی بار از سر نو تعمیر ہوئی علی الخصوص ۲۰۵ھ (۸۲۰ء) میں اس کے گنبد نیچے سے دبے ہوئے ہیں اور اس کی ساخت مستطیل ہے اور اس کے گرد احاطہ کی دیوار ہے جس پر ایک مینار جو فی الواقع ایک برج ہے نیچے سے مکعب اور اس کے اوپر تین طبقے ایک دوسرے سے چھوٹے ہیں۔ مینار کی جگہ پر اس قسم کا مکعب برج شمالی افریقیہ میں بہت پایا جاتا ہے اور شاذ اندلس میں بھی ہے۔ اگرچہ مسجد قیروان اور اس شہر کی

[1] عقبہ - یہ شخص عقبہ بن نافع القریشی ہے۔ مترجم

دوسری مذہبی یادگاریں کئی مرتبہ از سرِ نو تعمیر ہوئی ہیں لیکن ان میں اب بھی ایک خاص قدامت کا لطف ہے۔

یہی عقبہ جس نے قیروان کی بنا ڈالی بسکرہ کے قریب مدفون ہے وہ مسجد جسکے اندر اس قبر کی ہے مسجد سدی عقبہ کہلاتی ہے اور فی الواقع افریقیہ میں اسلام کی قدیم ترین عمارت ہے۔ اس میں بھی ایک مربع برج ہے۔

مسجد سیدی بومدین تلمسان کے قریب تلمسان پرانے زمانہ میں مغرب متوسط کا پایۂ تخت تھا اور یہ مسجد سات سو اتالیس ہجری (۱۳۳۸ء) میں تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کے اوقاف میں ایک مدرسہ ہے جو ۱۳۴۷ء میں بنا تھا۔ اور یہ اس قسم کی نہائت کمیاب عمارات افریقیہ میں سے ہے۔ اس مدرسہ میں علوم و تاریخ عربوں کے زمانہ عروج تک پڑھائی جاتی تھی۔

الجزائر کی مساجد تقریباً الجزائر کی کل مساجد جدید ہیں اور ان میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ جامع الکبیر ایک عمارت ہے جو ذکر کے قابل ہے اس کی تعمیر دسویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی۔ لیکن اس میں مختلف اوقات میں بہت کچھ ترمیمات ہوئی ہیں۔ اس کا مربع مینار علی الخصوص چودھویں صدی عیسوی کا ہے۔ عمارت کے اندر جس پر فی الحقیقت چونا پھرا ہے مطلق آرائش نہیں ہے۔ محرابیں جن پر چھت قایم ہے مربع نیل پایوں پر ایستادہ نعل اسپی شکل کی اور نہائت کم نکیلی ہیں۔ بہت سی ان میں سے دندانہ دار ہیں۔

اس مسجد کے ایک سائبان کے گرد بہت ہی خوبصورت غلام گردش ہے جس کی محرابیں نکیلی دندانہ دار اور نعل اسپی صورت کی ہیں اور اس کے ستون سنگ مرمر کے ہیں - یہ غلام گردش جو اصلی عمارت سے بہت بعد بنی ہے ہمیں ان محرابوں کو یاد دلاتی ہے جو اشبیلیہ کے القصر کے اندرونی صحن میں ہے - علاوہ اس مسجد کے الجزائر کی جو اسلامی عمارت ذکر کے لائق ہے وہ چھوٹا سا مقبرہ عبدالرحمن کا ہے جو اس میں مدفون ہے - اس کی وضع تعمیر سترھویں صدی عیسوی کی ہے - یہ عمارت خوبصورت ہے لیکن اس میں کسی قسم کی جدت نہیں ہے -

مراکش کی مساجد

مراکش میں بہت خوبصورت مساجد ہیں علی الخصوص مسجد مولے ادریس اور مسجد القاروین فاس میں - یہ اخیر عمارت تمام افریقیہ میں شہرت رکھتی ہے اور اس میں دو سو ستر ستون ہیں اور تیرہ دالان پر ایک بیس محرابوں کا - اہل یورپ کو اس عمارت میں داخل ہونے کی مطلق اجازت نہیں ہے -

مراکش کی اکثر مساجد کا وہی نقشہ ہے جو شمالی افریقیہ کی مساجد کا - اور ان میں بھی مکعب مینار ہیں جو مصر میں نہایت شاذ ہیں - تنجہ کی جامع مسجد کا مینار بھی اسی وضع کا ہے اور اس سے اس قسم کی عمارت کا ایک کافی اندازہ ہو سکتا ہے -

علاوہ چند چھوٹی مساجد کے مراکش میں عربوں کی اور کسی قسم کی مشہور یادگاریں نہیں پائی جاتیں لیکن جو چیز سیاح کو وہاں نظر آتی ہے وہ رسوم

وعادات اور لباس اور مشرقی طرز معاشرت ہے جو کہیں اور بہ مشکل نظر آتی ہے۔ مراکش ہی کے دیکھنے سے خلفا کے زمانہ کی معاشرت عرب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ الجزائر کے اور باستثنا دمشق۔ شام کے بڑے شہروں سے جن میں یورپ سرائیت کر گیا ہے معاشرت عرب کا نہائیت ناقص اندازہ ہوتا ہے۔ مراکش کا سفر آسان ہے اور ہم شائقین کو وہاں جانے کی صلاح دیتے ہیں۔ چند روز کے ریل کے سفر میں تمام فرانس اور اندلس کا ملک طے ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ملاگا (مالقہ) میں جہاز پر سوار ہو کر بہت ہی جلد جبرالٹر (جبل الطارق) کو پہنچ جاتے ہیں جو کہ ایک انگریزی شہر بے لطف و تاریک ہے لیکن اس سیاح کو جس کی طبیعت رنگیلی ہے انگلستان کا اتنی دور ملنا ناگوار ہوگا۔ کیونکہ جب وہ تھوڑی دیر کے جہازی سفر کے بعد مراکش سے تنجہ تک کے ساحل کو دیکھیگا۔ تو ان کا حسن جبل الطارق کے مقابلہ سے دوبالا ہو جائیگا۔ جبل الطارق میں تو اس وقت کا تمدن ہے لیکن تنجہ کے سفید مکانات میں جو اوپر تلے بنے ہوئے ہیں۔ اور اس کے مختلف الالوان مخلوق میں، اور پاشاؤں میں جن کا انصاف فوری ہے ہمیں اس معاشرت عرب کی تصویر نظر آتی ہے جو ہزار برس پہلے تھی۔ جب ہم اس پرانے شہر میں داخل ہوتے ہیں جس کی بنا ہرکیولز کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور جو امیر المومنین ہارون الرشید ہم عصر شہنشاہ شارلمین کے وقت میں بھی مشہور و معروف تھا تو ہمیں وہ عجیب و غریب خواب جس میں مساجد و مینار کنگرہ دار برج غلاموں کے بازار

برقع پوش عورتیں عرب شوخ رنگ لباس پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور
جو الف لیلہ کی کہانیوں کو یاد دلاتے ہیں سچا ہو کر ہماری آنکھوں کے
سامنے آجاتا ہے۔

اُندلس (ہسپانیہ) کی عربی یادگاریں

ابتدائے تسلط میں عربوں نے اپنی عمارات میں شرقی معماروں سے
کام لیا لیکن اُنہوں نے اپنی فطرت صناعی کا اثر ان معماروں پر ایسا ڈالا کہ
اس قسم کی خاص آرائشیں استعمال کیں جن کی وجہ سے اناڑی سے اناڑی
شخص بھی عربی اور شرقی عمارت کے فرق کو سمجھ جائیگا۔ جیسا عربوں نے
مصر میں کیا تھا ویسا ہی اندلس میں بھی انہوں نے بہت جلد شرقی طرز تعمیر
سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ طلائی زمین پر پھول بوٹوں کے عوض میں نسخی
گلکاریاں کتبوں میں ملی ہوئی قایم ہوگئیں۔ یہاں بھی مشرق کی طرح
انہوں نے بکثرت اُن آرائشی طاقچوں سے کام لیا جو چھوٹی چھوٹی محرابوں
سے بنے ہوئے تھے۔ یہ طاقچے پتھر کے داسوں پر قائم کئے جاتے
تھے اور ان کی تشبیہ شورے کی قلموں یا شہد کی مکھی کے چھتوں سے
دی گئی ہے۔ جب یہ کسی گنبد کے نیچے چاروں طرف لگائے جاتے
تھے جیسا کہ قصر الحمرا میں ہے تو ان سے ایک عجیب و غریب لطف پیدا
ہوتا تھا۔ محرابیں پہلے نعل اسپی کی صورت کی ہوتی تھیں اس کے بعد
ان میں انواع و اقسام کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ سادی نکیلی۔ دندانہ دار۔ نکیلی

پھول دار وغیرہ وغیرہ۔ نیچے سے دبی ہوئی محراب بالکل متروک ہو گئی تھی۔

قرطبہ کی مسجد جو آٹھویں صدی عیسوی کی ہے اور چند طلیطلہ کی یادگار ہیں جو اندلس کی ابتدائی طرز عربی پر تعمیر ہوئی ہیں اور اشبیلیہ کا گرالڈا جو بارھویں صد عیسوی کا ہے اور القصر جو زمانہ درمیانی میں تعمیر ہوا تھا اور غرناطہ کا الحمرا جس کی تعمیر چودھویں صدی میں ہوئی اس طرز کے عروج کی عمارتیں ہیں۔

ان عمارات میں جو مختلف اوقات میں اور مختلف طرز پر تعمیر ہوئی ہیں ایک باہمی مشابہت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ متحد الاصل ہیں اور یہی حالت کل اُن عمارات کی ہے جن کو عربوں نے تمام اقطار عالم میں تعمیر کیا ہے۔ قصر الحمرا غرناطہ میں۔ مسجد حسن قاہرہ میں۔ علاء الدین کا دروازہ دہلی میں یہ سب عمارات ایک ہی طرز تعمیر کے نمونے ہیں اگرچہ ان میں بوجہ اختلاف ملک و اختلاف اقوام کے مقامی فرق موجود ہیں۔ ان عمارات سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں میں کس درجہ مادہ خلاقی تھا۔ کہ وہ ہر ملک کی موجودہ اشیا کو ترتیب دیکر ایک نئی طرز پیدا کر لیتے تھے علاء الدین کا دروازہ جس میں عربی ایرانی اور ہندی مذاق مجتمع ہے بہت بڑی دلیل عربوں کی اس حیرت انگیز قوت کی ہے جس سے وہ ہر ایک چیز پر خاص مُہر کر دیتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں ہندوں سے ایران میں فارسیوں سے اور اندلس میں مشرقیوں سے تعمیر کے خیالات

اخذ کئے لیکن ان کی عمارات کی طرز عربی رہی۔

اب ہم بر سبیل اختصار عربوں کی اُن عمارتی یادگاروں کا ذکر کرینگے جو انہوں نے اندلس میں چھوڑی ہیں۔

قرطبہ کی عمارات

قرطبہ کی مشہور مسجد کو عبد الرحمن نے ۷۸۶ء میں شروع کیا۔ یہ عمارت جو مسلمانوں کی نظروں میں بعد مکہ معظمہ کے متبرک گنی جاتی ہے اندلس کی عربی یادگاروں میں ایک عمدہ ترین یادگار ہے۔ کانڈ لکھتا ہے کہ " یہ عمارت آٹھویں صدی کے آخر میں عبد الرحمن نے بنائی اور یہی اس عمارت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس مسجد کو بڑے پیمانہ پر مسجد دمشقیہ کا مقابل بنائے اور اس میں وہ عجیب آرائشیں اور گل کاریاں دکھائے جو ہیکل سلیمانی کو بھی جسے رومیوں نے برباد کیا بھلا دیں۔ یہ جامع مسجد عظمت و شان میں تمام مشرقی معابد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا مینار زمین سے اکہتر گز بلند تھا۔ اس کا گنبد جس کی چھت کے نیچے ترشی ہوئی لکڑی کا منطقہ تھا ایکہزار نزا نوے مختلف رنگ کے سنگ مرمری ستونوں پر قائم تھا۔ یہ ستون بساط شطرنج کے سے مربعوں میں نصب کئے ہوئے تھے۔ اور ایک مربع میں پانچ ستون تھے جس ترتیب سے عمارت کے طول میں انیس انیس گلیاں اور ان کو قطع کرتی ہوئی عرض میں اڑتیس کسی قدر تنگ گلیاں بن گئی تھیں۔ مسجد کا جنوبی رو کار دریائے کاڈل کوئی ور درود الکبیر کی جانب واقع ہوا تھا۔ اور اس میں انیس دروازے تھے جن پر نہایت باریک کام کی ہوئی کانسی کی پتریاں جڑی ہوئی تھیں۔ باستثناء بیچ کے دروازے کے

جس کی پتریاں سونے کی تھیں۔ مشرق اور مغرب کے رو کار میں بھی اسی قسم کے نونو دروازے تھے۔

باوجود اس کے کہ اندلس کے عیسائیوں نے اس عمارت کی بہت کچھ بے حرمتی کی ہے پھر بھی جامع قرطبہ اس وقت ایک عجیب عمارت ہے اس کو متبرک بنانے کی غرض سے اس کے اندر ایک بہت بڑے کلیسے کی تعمیر شروع کی گئی ہے۔ دیواروں کی آرائشوں اور کتبوں پر چونے کی استر کاری کردی گئی ہے۔ فرش مسجد کی پچی کاری کا کام اٹھالیا گیا ہے۔ وہ پر تکلف چھتیں کندہ کی ہوئی لکڑی کی فروخت کردی گئی ہیں۔ اس قدیم عمارت کی اصلی شان کا اندازہ کرنے کے لئے فقط ایک مصلے کا دیکھنا کافی ہے کہ یہی ایک جز عمارت کا اس وقت تک ان کی پردرد اور وحشیانہ دست برد سے بچا ہوا ہے۔

مسجد کی چھت ستونوں پر قائم تھی اور ان کی ترتیب اس وضع پر ہوئی تھی کہ ان کے تقاطع سے دونوں جانب کثرت سے متوازی راستے بن گئے تھے۔ ان ستونوں پر نہایت پر تکلف نعل اسپی محرابیں قائم تھیں۔ چھت زمین سے دس گز کے قریب بلند تھی جس کی وجہ سے زمانہ متوسط کے قدیم گاتھک کلیسوں کی سی (جیسی اس وقت کلون اور استراسبرگ کے کلیسوں میں ہے) تاریکی اس مسجد میں نہ تھی۔ محرابوں کے نیچے اوپر تعمیر اور آرائشوں کی خاص ترتیب کی وجہ سے اس عمارت میں ایک جدت اور خصوصیت ہے جو اس زمانہ کی کسی عمارت میں نہیں پائی جاتی۔

جامع قرطبہ کے مصلے کے بارے میں اگر ہم موسیو ژیرودے پران ژی کے الفاظ میں یہ نہ کہیں کہ " اس کی پر تکلف آرائش اور اس کا دلربا انداز کسی قدیم یا جدید عمارت عالم میں نہیں پایا جاتا " تو اقلاً ہمیں اتنا تو کہنا چاہئے کہ یہ مصلے ان تمام چیزوں میں جن پر انسان عش عش کر سکتا ہے ایک نہائت ہی خوبصورت چیز ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے وقت عربوں کی صنعت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس کے بعد ہی اس نے اعلےٰ درجہ کی شگفتگی حاصل کی اور الحمرا کی سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جن کی سربرآوردہ شوکت وعظمت سے اس کے بنانے والوں کا صنعتی مذاق ثابت ہوتا ہے اور جس کی رنگ آمیزیوں اور حیرت انگیز گل کاریوں کی خوش سلیقگی آنے والی نسلوں کے لئے ایک یادگار عظیم رہیگی۔

قرطبہ کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ہمیں عبدالرحمن کے قصر کا محض برسبیل تذکرہ نام لینا ضرور ہے کیونکہ اس قصر کا اب کوئی نشان باقی نہیں رہا اور اس زمانہ کی تاریخوں ہی سے اس کا پتہ لگتا ہے۔ مورخین عرب نے جو بیان اس طلسمی قصر زہرا کا جو قرطبہ سے چند فرسنخ پر دسویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا لکھا ہے کہ اسے ہم موسیو ژیرودے پران ژی سے نقل کرتے ہیں۔ ان مورخین نے اس تفصیل اور صحت کے ساتھ مسجد قرطبہ کا بیان لکھا ہے ان کا یہ بیان بھی غالباً بہت صحیح ہوگا۔

" اس عمارت میں چار ہزار تین سو ستون قیمتی سنگ مرمر کے نہائت عمدہ ترشے ہوئے نصب تھے۔ قصر کے دالانوں میں مربع سنگ مرمر کا فرش

جس میں ہزاروں قسم کی گل کاریاں نقش بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر بھی سنگ مرمر
کی استر کاری تھی جس پر مختلف رنگوں کے گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ چھتوں
میں سنہری اور زنگاری رنگ آمیزیاں نہایت تکلف کے ساتھ پیچ در پیچ
تھیں۔ شہتیر اور چھت کے تختے صنوبر کی لکڑی کے نہایت نازک اور بیش
قیمت تھے۔ بعض دالانوں میں خوش نما فوارے صاف اور پاکیزہ پانی کے
چھوٹ رہے تھے اور ان کی پھواریں مختلف شکل کے سنگ مرمری حوضوں
میں گر رہی تھیں۔ اس دالان میں جس کا نام قصر الخلیفہ تھا ایک سنگ یشب کا
حوض تھا جس کے اوپر سونے کا بگلا قسطنطنیہ کی عمدہ دستکاری کا بیٹھا ہوا
تھا اور چھت سے وہ مشہور موتی لٹک رہا تھا جسے شہنشاہ غربی نے عبدالرحمن
کے لئے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔ القصر کے سامنے بڑے بڑے باغ تھے۔
جن میں کہیں تو میوے کے درخت تھے اور کہیں آس اور نیچ پیچ کی ٹہنیاں
جن کے گرد پانی کے چشمے رواں تھے۔ باغ کے وسط میں خلیفہ کا کوشک
بلندی پر بنا ہوا تھا اور اس کے ستون سفید سنگ مرمر کے تھے اور ستونوں
کے اوپر کا حصہ مطلا تھا۔ اسی کوشک کے وسط میں وہ سنگ سماق
کا مشہور حوض تھا جس میں پارہ بھرا ہوا تھا اور ایک خاص اختراع کے
ذریعہ سے اس میں آفتاب کی شعاعیں نہایت لطف کے ساتھ منعکس
ہوتی تھیں۔ ان ہی باغوں میں شاہی حمام بھی تھے جن کے حوض سنگ مرمر
کے تھے۔ در میں انواع واقسام کے ریشمی اور پشمینی اور سوتی قالینیں بچھی ہوئی
تھیں جن میں سے کسی پر تو پھول بوٹے اور درخت بنے ہوئے تھے

اور کسی پر جانور۔ لیکن اس عمدگی سے کہ یہ سب اصلی معلوم ہوتے تھے۔
"سفید سنگ مرمر المریہ سے آیا تھا اور گلابی اور سبز پتھر قرطاجنہ اور تونس سے۔ وہ طلاکار اور منقش فوارہ بعض کہتے ہیں کہ شام سے آیا تھا اور بعض کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ سے۔ اس فوارہ پر انسانی مورتیں بنی تھیں۔ جنہیں احمد یونانی نے بنایا تھا۔ خلیفہ نے بارہ حیوانات کی شکلیں سونے اور بیش قیمت پتھروں کی قرطبہ کے شاہی کارخانہ میں بنوا کر اس کے گرد نصب کی تھیں اور ان کے منہ سے ہر وقت پانی جاری تھا۔
"قصر الخلیفہ کی چھت سنہری شفاف اور مختلف الالوان سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھی اور دیواروں پر بھی یہی پتھر لگے ہوئے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا مدور حوض سنگ مرمر کا تھا۔ جس میں پارہ بھرا ہوا تھا اور حجرہ کی ہر طرف آٹھ آٹھ در تھے جن کی محرابیں ہاتھی دانت اور آبنوس کی بنی ہوئی سونے اور جواہرات سے مرصع تھیں۔ ان محرابوں کے ستون مختلف الالوان سنگ مرمر اور بلور کے تھے۔ ابن حیان لکھتا ہے کہ اس قصر میں چار ہزار تین سو بارہ چھوٹے بڑے ستون تھے جن میں سے ایک ہزار تیرہ ستون افریقیہ سے انیس شہر روم سے آئے تھے اور ایک سو چالیس شہنشاہ قسطنطنیہ نے عبدالرحمن کو بطور ہدیہ بھیجے تھے۔ بقیہ ستون اندلس کے مختلف خطوں سے آئے تھے کچھ طرکونہ سے اور باقی دوسرے مقامات سے۔ کل دروازے آہنی تھے یا مسی جن پر سونے اور چاندی کا کام کیا ہوا تھا۔"

عربوں کی یادگاریں طلیطلہ میں | اس وقت طلیطلہ کیسا ہی اجڑا اجڑا شہر کیوں نہ ہو وہ ایک سچی تصویر ہے زمانہ متوسط کے یورپ کے شہروں کی۔ اس شہر کا عالیشان کلیسہ اور پُر رونق خانقاہ سیان جوآن ڈے لاس رے ایس اُس کی شہرت کے لئے کافی ہے۔ ان عمارات کے سوا ہمیں ہر قدم پر عربوں کی صنعتی تسلط کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔

اس وقت بھی طلیطلہ کے گرد عربوں کی بنائی ہوئی فصیل اور ان ہی کے بنائے ہوئے برج موجود ہیں۔ منجملہ شہر کے پرانے دروازوں کے بسکرہ کا دروازہ مشہور ہے جو نویں صدی عیسوی میں شروع کیا گیا تھا اور نیز باب الشمس جو دسویں صدی کا بنا ہوا ہے اس سے کم مشہور نہیں ہے۔ باب الشمس کو جیسا کہ عام خیال ہے میں مشرقی عمارات میں محسوب نہیں کرتا کیونکہ محرابوں کی قطع اور آرائشوں کی وضع اور عمارت کی مجموعی شان پر اسلام کی مہر معلوم ہوتی ہے۔

منجملہ عمارات یہود و عرب کے جو طلیطلہ میں واقع ہیں میں سانتا ماریا لابلانکا کو بھی جو یہودیوں کی قدیم ہیکل ہے شمار کرتا ہوں۔

طلیطلہ میں ہزاروں قسم کی آرائشیں اُن عرب صناعوں کی بنائی ہوئی نظر آتی ہیں جو مسلمانوں کے اخراج عام سے پہلے عیسائی حکومت کی رعایا تھے وہ عربی گل کاریاں جو رومی یعنے گوتھک طرز کی عمارات میں نظر آتی ہیں ان ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ طرز عربی اور طرز عیسوی کے میل سے اندلس میں ایک نئی طرز عمارت پیدا ہوئی جسے مدیر کہتے ہیں اور یہ طرز مدت دراز تک باقی رہی بلکہ جیسا کہ حال کی عمارات اشبیلیہ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے اُس وقت

بھی اس کا اثر موجود ہے۔

عمارات عرب اشبیلیہ میں اگرچہ اشبیلیہ اور طلیطلہ میں کسی قدر فرق ہے لیکن یہاں بھی ہر قدم پر عربوں کے تسلط کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ حال کے اکثر مکانات کی طرز عربی ہے۔ عوام الناس کا ناچ اور باجا بھی اس وقت تک عربی ہے۔ یہاں کی عورتوں میں عربی خون کا اثر نہائت بیّن طور پر نظر آتا ہے۔ اشبیلیہ کی سب سے قدیم عربی عمارت ایک برج ہے جسے گرالڈا کہتے ہیں یہ ایک خوبصورت مکعب عمارت سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے اور ونس کے برج سینٹ مارک اور افریقیہ کے میناروں کی ہم شکل ہے۔ قرین قیاس ہے کہ گرالڈا اُس مسجد کا مینار ہے جسے المنصور نے ۱۱۹۵ء میں تعمیر کیا تھا۔ گرالڈا کے باہر کی جانب پتھر کی تراشی ہوئی جالیاں اور جابجا کھڑکیاں ہیں جن میں سے بعض کی محرابیں پھیلی ہوئی ہیں اور بعض پھول دار اور نکیلی ہیں پہلے اس کے اوپر ایک مطلا فلزی کرہ تھا اب اس کی جگہ ایک گھنٹہ قائم کیا گیا ہے جس پر ایک مورت دین عیسوی کی علامت میں نصب کی گئی ہے۔

اشبیلیہ کا القصر ایک بہت بڑا عربی قصر ہے جس کی تعمیر مختلف اوقات میں ہوئی ہے۔ اصلی عمارت گیارھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی تھی۔ لیکن اس کا بہت بڑا حصہ تیرھویں صدی کا ہے۔ اس کا رُوکار پیٹر[۱] بے رحم کی

---

[۱] پیٹر بے رحم قسطیلہ اور لیون کا بادشاہ تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی ایک شادیاں کیں اور اپنی بی بیوں کو چھوڑتا گیا۔ اس کے ظلم و تعدی سے رعایا نے ۱۳۶۶ء میں بلوہ کیا سال ولادت ۱۳۳۴ء سال وفات ۱۳۶۹ء۔ مترجم

عہدحکومت میں عرب کاریگروں نے بنایا تھا۔ چارلس پنجم نے بھی اس عمارت کو آراستہ کرنا چاہا لیکن اس نے محض چند آرائشیں شرقی طرز پر بڑھادیں جن میں مطلق خوبی نہیں پائی جاتی۔

چونکہ اس عمارت میں عیسائی بادشاہ رہتے تھے اس لئے اندلس میں بھی ایک یادگار اس قسم کی باقی رہنے پائی ہے۔ اس کے دالانوں کی رنگ برنگی آرائشوں سے جن پر پہلے عیسائیوں نے اپنے قاعدہ کے موافق چونا پھیر دیا تھا لیکن جن میں ڈیوک ڈے مانٹ پین سی اے نے دوبارہ اصلی حالت پر درست کردیا ہمیں ایک اندازہ الحمرا کے دالانوں کی اس حالت کا ہو سکتا ہے جب اس کی دیواروں پر چونا نہیں پھیر اگیا تھا۔ القصر کا بیت البکر جہاں روایت کے مطابق عیسائیوں سے کواری لڑکیوں کا خراج لیا جاتا تھا اور نیز بیت السفرا نہائت ہی خوبصورت ہے۔ یہ بیت السفرا باستثنا چند آرائشوں کے جو اس میں سے کم ہوگئی ہیں فی الحقیقت ایک عجائبات دنیا میں سے ہے دمشق اور قاہرہ کی بعض مساجد کے سوا القصر ہی وہ عمارت ہے جہاں ہمیں عربوں کی ان تختہ بند چھتوں کی شان نظر آتی ہے جن میں انواع و اقسام کی رنگ آمیزیاں اور مرصع کاریاں پائی جاتی ہیں، جو ہمارے شاہی مکانات کی جان ہیں۔

اندلس کے شہروں میں اشبیلیہ ہی سب سے زیادہ زندہ اور مہذب شہر ہے۔ اس خاص امر میں یہ غرناطہ سے بالکل علیحدہ ہے کیونکہ وہاں اس وقت تک زمانہ متوسط کے وحشیانہ خیالات اور غیر اقوام سے

عداوت موجود ہے۔

عربوں کی عمارات غرناطہ میں | قصر الحمرا ہیں جسے عرب قلعۃ الحمرا کہتے ہیں اور جس کی تعمیر چودھویں صدی عیسوی میں ہوئی اندلس کے عربی طرز تعمیر کا اعلےٰ درجہ کا نمونہ نظر آتا ہے۔

یہ قصر شہر کے کنارہ ایک ٹیلہ پر واقع ہوا ہے جو سیرا نواڈا کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے نیچے اور فی الواقع دنیا کے بہترین موقعوں میں سے ہے قصر بالکل شہر غرناطہ اور دیائے ویگا کی زرخیز زمینوں پر مشرف ہے۔

ٹیلے کے نیچے سے الحمرا کے سرخ رنگ مربع برجوں کی چوٹیاں ہی نیلگوں آسمانی زمین پر نظر آتی ہیں اور ان کے نیچے کا حصہ سبزہ زار میں چھپا ہوا ہے اگر ہم اس کے پرانے درختوں کی قطاروں میں جن میں انواع واقسام کے پرند چہچہا رہے ہیں اور جن کی دونوں طرف پانی کے چشمے رواں ہیں چلیں تو تھوڑی دیر میں ہم اس مشہور قصر کے دروازہ پر پہنچینگے۔

قصر الحمرا کے ایسے بیان لکھنے کا قصد کرنا جس سے اس کا اصلی اندازہ ہو سکے بیفائدہ ہے۔ مصوری کا قلم اس کام کو کر سکتا ہے اور اسی قلم سے ہم نے کام بھی لیا ہے

اس قصر کی ہر ایک چیز حیرت انگیز ہے اور انسان کو اس کی دیواروں کے سامنے جن پر طرح طرح کی نقشی گلکاریاں جالی کی صورت بنی ہوئی ہیں اس کی نکیلی گلکار محرابوں کے آگے ان طاقچوں کے آگے جن میں قلمیں لٹکتی ہوئی نظر آتی ہیں اور جن پر کسی زمانہ میں سرخ اور زرنگاری کام تھا کھڑے ہو کر گھنٹوں عش عش کرنیکے

اور کوئی چارہ نہیں۔

مثل دوسرے عربی قصروں کے الحمرا بھی یورپ کے قصور شاہی سے مطلق مشابہ نہیں ہے اس عمارت میں روکار مطلق نہیں ہے اور اس کی ساری آرائش اندرونی ہے ہر ایک چیز حیرت انگیز لیکن چھوٹے پیمانہ پر ہے۔ یہاں وہ بڑے بڑے سنسان اور سرد دالان جو یورپ کے شاہی قصروں میں دیکھنے والوں کو تو بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن رہنے والوں کے لئے موجب تکلیف ہیں نہیں پائے جاتے۔ الحمرا کے دیکھنے سے عربی بادشاہوں کی طرز معیشت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کھڑکیوں سے جہانتک نظر پہنچتی ہے آسمان نظر آتا ہے اور اُن پر تکلف لنذرجہ کے باغوں کے دیکھنے سے انواع و اقسام کے منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ یہ وہ باغ ہیں جن میں سلاطین غرناطہ کی ممتاز بیبیاں جن میں حسین سے حسین عورتیں مشرق و مغرب کی شامل تھیں چمنوں کے سبزے کی بہار دیکھنے اور پھولوں کی مہک سونگنے آیا کرتی تھیں۔

ایسے قصر کے اندر صناعوں اور تمام عالم کے مشہور علماء کے دائرہ میں گھر کر اندلس کا بادشاہ اپنے تئیں تمام روئے زمین کے بادشاہوں سے زیادہ خوش نصیب سمجھتا تھا اور جیسا کہانیوں میں لکھا ہے ایسے بھی شاہان ہندوستان کی طرح سے حق تھا کہ اپنے قصر کے دروازے پر یہ شعر لکھے ؎

اگر فردوس بر روے زمین است　　ہمین است و ہمین است ہمین است

فن مصوری اور فن عکس کشی نے الحمرا کے خوبصورت حصوں کو مشہور و معروف کر دیا ہے۔ قصر اللیوث اور بیت الاختین اور وہ ایوان جو ابن السراج اور بیت العدل

کہلاتے تھے اس وقت بھی مشہور ہیں۔ شیروں کا ایوان فی الواقع نہائت ہی پر تکلف ہے۔ موشیو زیرودی پرین ژری لکھتے ہیں " دروازہ البرکہ سے جس وقت قصر اللیوث میں داخل ہوں تو دل کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا محرابدار غلام گردشیں ہر قسم کی محرابوں سے بنی ہوئیں اور ان میں پھول بوٹے اور قلمکاریاں جن پر گچکاری کی جالیاں چڑھی ہوئیں جو کسی وقت میں سونے اور مختلف قسم کی رنگ آمیزیوں سے مرصع تھیں ہر طرف دور تک چلی جاتی ہیں اور آنکھوں کے سامنے ایک جنگل ستونوں کا نظر آتا ہے کہیں علیحدہ کہیں دو دو کہیں اور مختلف ترکیبوں سے لیکن ہر حالت میں دلپذیر۔ ان کے بیچ میں شیروں کے حوض کا فوارہ چھٹتا ہوا اور اس کی پھواریں آفتاب کی کرنوں میں چمکتی ہوئیں عجیب جوبن دکھاتی ہیں۔

روائت کے مطابق اسی حوض میں چھتیس بنی سراجیوں[۱] کے سر کاٹ کر ڈال دئے گئے تھے بلکہ عوام میں مشہور ہے کہ رات کو اس میں سے ہولناک اور مہیب صورتیں پیدا ہوتی ہیں اس فوارے کے گرد جو شیر ہیں وہ فی الواقع بالکل خیالی ہو رہے ہیں جو کسی جانور سے مشابہ نہیں ہیں۔ یہ اس درجہ خلاف فطرت بنی ہوئی ہیں کہ گویا صناع نے انہیں بالارادہ ایسا بنایا ہے۔ یہ محض ایک نوع کی آرائش ہیں اور درحقیقت ان سے مراد شیر نہیں ہیں۔

[۱] بنو سراج پندرھویں صدی عیسوی میں ایک مشہور غرناطہ کا خاندان تھا۔ اس قوم کا پہلا شخص یوسف بن سراج تھا۔ انہوں نے محمد ہفتم کی بہت کچھ مدد کی تھی اور ابو عبداللہ کے وقت میں کل خاندان عوت میں بلا کر قصر الحمراء کے اس حجرہ میں قتل کیا گیا جو آج تک بنی سراج کے نام سے مشہور ہے۔ مترجم

ناظرین الحمرا سے جب یہ کہا جائے کہ اس قصر کی آرائشیں مثل قاہرہ اور ہندوستان کے ترشے ہوئے پتھر کی نہیں ہیں بلکہ گچ سے بنائی گئی ہیں تو انہیں مشکل یقین آیگا فی الواقع جس باریکی اور برجستگی سے یہ نقش ونگار بنے ہیں اور ان میں جس طرح کی جلا دی گئی ہے اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ تراشیدہ سنگ مرمر کی نہیں ہیں۔ جب تک میں نے اس گچ کے ایک ٹکڑے کا امتحان نہ کرالیا۔ مجھے خود اس امر کا یقین نہ ہوتا تھا۔ اس کیمیائی تحقیق کو میں نے موسیو فریڈل رکن مجلس علمیہ فرانس کے سپرد کیا تھا اور ان کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ ایک قسم کا چونا ہے جسے سلفیٹ[۱] آف لائم کہتے ہیں۔

اس چونے میں کچھ تھوڑا سا میل اجزائے نباتی کا ہے لیکن بڑا جز الحمرا کی کل آرائشوں کا یہی چونا ہے جس گچ میں یہ قوت ہو کہ وہ پانسو برس کی بے اعتدالیوں کو جھیل لے البتہ وہ بہت ہی بڑے اہتمام سے تیار ہوئی ہوگی۔ میں ایسا خیال نہیں کرتا کہ یورپ کا کوئی صناع اس قسم کی گچکاریوں کا ذمہ لے سکے جو بلا زوال کے اتنی مدت دراز تک اپنی اصلی حالت پر قایم رہ سکیں۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اندلس کی آب وہوا نے الحمرا کی دیواروں کو اس وقت تک قایم رکھا ہے کیونکہ عربوں کے بعد جن حصوں کی تجدید کیگئی ہے وہ بہت کچھ متغیر ہوگئے ہیں

---

[۱] سلفیٹ آف لیم گندھک کے تیزاب اور چونے کا مرکب ہے یہ بطور خلقی پیدا ہوتا ہے اور اسے کیسم کہتے ہیں کیسم کے باریک پیسنے سے وہ مصالح بنتا ہے جس سے سنگ مرمر کا کام لیا جاتا ہے اس کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ پانی ملانے سے آٹے کی طرح نرم ہوجاتا ہے اور اس میں ہر ایک قسم کی شکل بنائی جاسکتی ہے اور سوکھنے کے ساتھ ہی اس میں پتھر کی سی صلابت آجاتی ہے۔ مترجم

یہ حصے نہایت آسانی کے ساتھ متمیز ہوتے ہیں کیونکہ ان میں وہ نکیلا پن نہیں ہے
اوران کی سطحیں ترچھی ہوئی ہیں اوران کی شکلوں میں صریح بھدا پن ہے۔

کل صناع اور اہل کمال جنہوں نے الحمرا کو دیکھا ہے اندلس کے نصاریٰ
کی اس عجیب و غریب وحشیانہ حرکت کو افسوس کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو ان سے
اس قصر کے برباد کرنے میں سرزد ہوئی۔ چارلس پنجم نے تو اس کا ایک حصہ اس
غرض سے توڑ ہی ڈالا تھا کہ اس کے مصالحے سے ایک دوسری بے ڈھنگی عمارت
بنا دے لیکن اور حکومتوں نے بھی اس کو محض ایک پرانا ویرانا سمجھ لیا جس کی
اشیا دوسرے کاموں میں مستعمل کی جا سکیں۔

موسیو داوی لیئر اپنی کتاب اندلس میں لکھتے ہیں "وہ پر تکلف چینی کی تختیاں
جو قصر کے دالانوں میں نصب تھیں چند سال قبل پیس کر چونا بنانے کی غرض سے
فروخت کر دی گئیں۔ مسجد کا کانسی کا دروازہ پرانے تانبے کے نام سے بکا اور وہ
بیش بہا لکڑی کے کندہ کئے ہوئے دروازے جو دار بنی سراج میں لگے ہوئے تھے
ایندھن کے کام میں لائے گئے۔ جو کچھ مال و متاع اس میں سے بک سکتی تھی اس کے
فروخت کرنے کے بعد یہ عمارت بطور محبس کے کام میں لائی گئی اور اس میں فوجی رسد
کا کارخانہ بنایا گیا،، صفائی کی آسانی کی غرض سے تمام نسخی آرائشوں اور گلکاریوں
پر چونے کی استرکاری کر دی گئی۔ یہ انوکھی طرز جو اندلس کے عیسائیوں کو بھی اسی طرح پسند ہے
جیسی انگریزوں کو بعض مہذب[۵] اقوام میں اس درجہ جاری ہے کہ گویا ان کی روزمرہ کی

---

۵ اندلس کے عیسائیوں کی اپنی صنائع کی طرف سے بے پروائی کو اطالیہ کے باشندوں کی احتیاط سے مقابلہ
کرنے میں لطف آتا ہے۔ مثلاً جب کسی نے فلارنس کی سیر کی ہے وہ جانتا ہے کہ بہت سی (دیکھو صفحہ ۹۴)

ضروریات میں شریک ہوگئی ہے یہ سفید سطحیں بعض اشخاص کی آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور کسی قدر اس عامیانہ خیال مساوات کو پورا کرتی ہیں جو روز بروز یورپ میں پھیلتا جاتا ہے۔

ایک مدت تک تو مصور اور صناع ہی الحمرا کی حالت موجودہ پر افسوس کرتے رہے لیکن آخر باشندگان غرناطہ کے دلوں پر سنتے سنتے اثر پڑا اور انہوں نے اس طلسمی قصر کی اصلاح حالت کا ارادہ کیا۔ اس وقت مورتوں اور کندوں پر سے چونا کھرچا گیا اور کسی قدر مرمت بھی کی گئی مگر کام نہایت ہی سستی سے چل رہا ہے کیونکہ وہ کاریگر جو نمونے سامنے رکھ کر باسانی کام کر سکتے تھے اب ان نمونوں کے تلف ہو جانے کی وجہ سے

(بقیہ صفحہ ۹۳) عمدہ عمدہ مورتیں وہاں ایک عام مقام پر رکھی ہوئی ہیں اور ہر شخص کا ہاتھ ان تک پہنچتا ہے لیکن کوئی ان کو نہیں چھوتا۔ برخلاف اس کے غرناطہ میں اتوار کے دن سیر کرنیوالوں کا بڑا شغل یہ ہے کہ وہ چارلس پنجم کے قصر کے کھنڈر کی مورتوں اور آرائشوں کو پتھر مار مار کر توڑتے ہیں۔ جس وقت میں فلپ دوم کے اس قصر میں گیا جس کا نام اسکوریل ہے اور جس کی تاریکی اس زمانہ کے عیسائیوں کی خصائص کا ویسا ہی نمونہ ہے جیسے الحمرا کی روشنی اور چمک عربوں کی خصائص کا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ نیچے کی منزل کی چھت اور دیواروں کی کل تصویریں نہایت بیدردی سے کھچی ہوئی ہیں اور جب میں نے محافظ سے دریافت کیا تو اس نے ایک بیچ پروائی سے جواب دیا کہ جو لوگ یہاں کو بطور سیر آتے ہیں وہ اپنی چھڑیوں اور چاقوؤں سے ان تصویروں کو کھرچا کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ فلارنس کے باشندے نہایت ہی خلیق ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر سیر کرنیوالے لوگ ان کی صنائع کے ساتھ ایسی سلوکی کریں تو وہ یا تو زندہ جلا دئے جائیں یا سنگسار کئے جائیں۔

میں اس قدر البتہ کہونگا کہ ظاہرا اندلس کے عیسائی اس خاص معاملہ میں کسی قدر خواب غفلت سے جاگے ہیں جیسے دو اسرہ کا ثبوت ان دو جلدوں سے ہوتا ہے جن میں ملک کی قدیم عمارتوں کا بیان کیا گیا ہے اور جن کا ذکر میں نے مقدمہ میں کیا ہے یہ حقیقت میں رشک کے لائق ہیں۔ مصنف

بہت مشکل سے ویسا کام بنا سکتے ہیں اور اندلس میں تو ان کی قلت بھی ہے۔

علاوہ الحمرا کے ایک دوسرا عربی قصر بھی ہے جس کو عسکریہ کہتے ہیں لیکن اس کو اس قدر چونا پھیر اگیا ہے کہ اس کی اصلی حالت کا کچھ بھی پتہ نہیں لگتا۔ اس کا ایک باغ البتہ عمدہ ہے ورنہ اور کوئی شے اس میں ایسی نہیں ہے جو کتب سیاحت کے مبالغوں کی تصدیق کر سکے۔

خود شہر غرناطہ کے متعلق شعرائے عرب کا بیان پڑھنے کے بعد میں تو کسی سیاح کو وہاں جانے سے نہیں روک سکتا۔ شاعر کہتا ہے "اس سے زیادہ دلربا کوئی شہر نہیں جس پر آفتاب درخشان ہو یہ فی الواقع اندلس کا دمشق ہے"

میں نہیں جانتا کہ عربوں کا پرانا غرناطہ کیسا تھا مگر اس وقت کا غرناطہ تو محض ایک قصبہ افسردہ اور بے ترتیب ہے اور اس میں وصف اسی قدر ہے کہ اس کا مقام بہترین مواقع میں سے ہے اور اس میں غیر معمولی یادگاریں مثل قلعہ الحمرا اور بڑے کلیسے کے موجود ہیں خود قصبہ کے مکانات میں کسی قسم کی طرز نہیں پائی جاتی اور اس کی آب و تاب کی ثنا خوانیاں جو حال کی کتابوں میں نظر سے گذری ہیں ان کا تو کہیں پتہ بھی نہیں ہے اس وقت کا غرناطہ بالکل ایک مردہ بستی ہے اور اس کی یہ حالت اشبیلیہ کی چہل پہل کے مقابلہ میں نہایت حیرت انگیز ہے۔ غرناطہ کے باشندے نہ فقط انتہا درجہ جاہل اور متعصب اور بےعقل ہیں بلکہ ان میں مہمان نوازی کا وصف بھی نہیں ہے میں نے یہ بھی دیکھا کو کتب خانہ اشبیلیہ میں جس کثرت سے ہیں اسی قدر غرناطہ میں نادر الوجود ہیں میں اندلس کی عربی یادگاروں کے بیان کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ اگر ہم ان میں سقوبیہ کے قصر کو اور چند اور عمارات کو جن کا ذکر ایک دوسری جگہ درج ہے

جہاں تمدن عرب کا اثر یورپ پر دکھایا گیا ہے شریک کردیں تو ہمارے سامنے ایک کامل تصویر اُن عمارات کی آجاتی ہے جو اس وقت اندلس میں موجود ہیں۔ ان کی موجودہ حالت نہائت ہی پژمردہ ہے اور یہ ایک زمانہ عروج کی محض یادگاریں ہی رہ گئی ہیں مگر یہ یادگاریں ہیں کہ اگر بالفرض اُن عربوں کی ساری علمی اور ادبی کرتوت صفحۂ دنیا سے مٹ بھی جائے تو ان کی عظمت وشان کا اندازہ ان باقیات الصالحات سے پوری طرح ہو سکیگا۔

عربوں کی مختلف عمارتی یادگاروں کا باہمی مقابلہ

شام کی یادگاریں منجملہ شام کی یادگاروں کے جن کا ذکر اس وقت تک ہم نے کیا ہے وہی ہیں جو آں حضرت صلعم کے بعد کی ہیں۔ لیکن آپ کے زمانہ سے پہلے بھی اقوام عرب اس ملک میں رہتی تھیں اور انہوں نے بڑی بڑی حکومتیں قائم کی تھیں۔ بعض یران عمارتوں سے جو بصرے میں کھود کر نکالی گئی ہیں لیکن جن کی طرف بہت کم توجہ ہوئی ہے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی تعمیر نے بڑی ترقی کی تھی اور قرین قیاس ہے کہ جس وقت عرب شام میں پہنچے تو انہوں نے اپنے پرانے ہم ملکوں کی یادگاروں سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن کافی شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس گم شدہ زمانہ کی عمارتوں کا کچھ ذکر نہ کر سکے اور محض عمارات اسلامی علی الخصوص مسجد حضرت عمرؓ اور مسجد اقصے کے ذکر پر اکتفا کی اور فی الواقعہ یہ عمارات نہائت قدیم اور مختلف طرزوں کی ہیں اور اقلاًان کے بعض حصے پہلی صدی ہجری کے بنے ہوئے ہیں۔

ان تینوں عمارتوں میں سے بہت سی میں شرقی اور ایرانی طرزوں کا اثر جن سے شام کی کل اسلامی عمارتیں متاثر ہیں پایا جاتا ہے۔ یہ بھی غور کے قابل ہے کہ

ان عمارتوں اور ان کے پرانے حصوں میں نکیلی اور نعل اسپی محراب کی ابتدا نظر آتی ہے یعنی ان کی محرابیں اوپر سے کسی قدر نوکدار اور نیچے کو کسی قدر مڑی ہوئی ہیں۔ یہ خاصیت مسجد دمشق کے صحن کی محرابوں میں اور مسجد اقصیٰ کی کل محرابوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرز کو میں نے مسجد حضرت عمرؓ کے اندرونی محرابوں کی پہلی قطار میں دیکھا ہے۔ ان کل قدیم عمارتوں میں دو ستونوں کے بیچ میں شہتیر ہوا کرتے تھے جو خاص عربی طرز سے متعلق ہیں۔

شام کے پرانے مینار عموماً مربع ہوا کرتے تھے جیسا کہ مسجد دمشق کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

گنبدوں کا استعمال بھی شام میں تھا لیکن یہ مثل مشرقی گنبدوں کے دبے ہوئے ہوتے تھے مسجد حضرت عمرؓ کا گنبد البتہ ایسا نہیں ہے لیکن وہ مسجد کی تعمیر کے بہت دنوں بعد دوبارہ بنایا گیا تھا

مصر کی یادگاریں — ہم نے اپنی کتاب کے اس باب میں جہاں تاریخ مصر کا ذکر کیا ہے ان مختلف تغیرات کو بھی دکھایا ہے جو اسلامی عمارتوں میں آٹھ صدیوں کے اندر یعنے مسجد عمر کی بنا سے (۶۴۲ء) مسجد قائیت بائی تک جس کی بنا ۱۴۶۸ء میں ہوئی واقع ہوئی۔ ان عمارات کی طرز اوائل میں شرقی ہے لیکن عربوں کی فطرت صناعی نے بہت جلد اپنے کو بیرونی اثر سے الگ کر کے نئی طرز تعمیر پیدا کی۔

اگرچہ مسجد عمرو میں کئی مرتبہ تجدید ہوئی ہے بظاہر اس کا ایک حصہ اس وقت تک قدیم حالت میں ہے اس میں اس نکیلی اور نعل اسپی محراب کی ابتدا نظر آتی ہے مینار بالکل سادہ ہیں اور ان میں ایک ہی کٹہرا ہے اور یہ اوپر کو نکیلے ہیں۔

مسجد طولون جو ۸۷۶ء میں بنی شرقی طرز عمارت کے اثر سے علیحدہ معلوم

ہوتی ہے۔ محرابیں بالکل نکیلی اور پایہ دار ستونوں پر قایم ہیں جن کے چاروں کونوں پر ستون بنے ہوئے ہیں۔ پھول بوٹے نئی قسم کے ہیں اور ان میں نئی کلگاریوں کی جھلک آچلی ہے۔ قلمی آرائش کا اسوقت تک وجود نہیں ہے۔

طولوں کی مسجد اینٹوں سے بنی ہوئی ہے۔ اس کا مینار سہ منزلہ ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی بیرونی آرائش نہیں ہے مگر ہر منزل کی شکل علیحدہ ہے نیچے کی منزل مربع ہے اس کے بعد کی منزل مدور اور اوپر کی منزل مثمن ہیں۔

مسجد ازہر میں جس کی ابتدا دسویں صدی عیسوی میں کی گئی مگر تکمیل اس کے مابعد کے سنین میں ہوئی آرائش بہت اعلےٰ درجہ کی اور مختلف اقسام کی ہے۔ محرابوں کی قوسیں بمقابل اس کی ماقبل کی مسجدوں کے بہت زیادہ نکیلی ہوگئی ہیں قلمی آرائش ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ میناروں کے گرد کئی کٹہرے ہیں۔ اور ان میں بڑی آرائش کی گئی ہے۔

قلاؤں کی مسجد (۱۲۸۴ء) فی الواقع نکیلی طرز تعمیر کا عروج دکھاتی ہے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس عمارت میں اور ازمنہ متوسط کی گاتھک یادگاروں میں بہت مشابہت ہے۔

مسجد حسن (۱۳۵۶ء) اس زمانہ کی عمارات کا نمونہ ہے جبکہ عربی طرز تعمیر اعلےٰ درجہ کی ترقی کو پہنچ چکی تھی۔ یہ عظیم الشان یادگار جس کی دیواروں کا آثار تقریباً تین گز ہے اور جس کی بلندی تقریباً بائیس گز اور گنبدوں کی اونچائی تقریباً ساٹھ گز اور میناروں کی بلندی تقریباً پچانوے گز ہے بمقابل قدیم مساجد کے زیادہ تر ہمارے بڑے بڑے گرجوں کے مماثل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

ضرورت کے وقت عرب بہت ہی عظیم الشان اور مستحکم عمارتوں کے بنانے پر بھی قادر تھے۔

مسجد برقوق (۱۳۸۴ء) مسجد المؤید (۱۴۱۵ء) اور علی الخصوص مسجد قائیت بائی (۱۴۶۸ء) عربوں کے فن تعمیر کی ترقی کی مثالیں ہیں۔ مسجد قائیت بائی کا خوبصورت گنبد اور اس کا شاندار مینار اور ان کی پرتکلف کنگرین۔ چھجے۔ اور کٹہرے اور بے نظیر سنگ تراشیاں۔ اس میں ایک حیرت انگیز خوبی اور جدت پیدا کرتی ہیں۔ اگر عربوں کی یادگاروں میں یہی ایک عمارت رہ جاتی تو بھی اس سے ثابت ہو جاتا کہ ان کی صنعت تعمیر کو کسی اور طرز سے مطلق مشابہت نہیں ہے۔

مسجد قائیت بائی اور اسی زمانہ کی اور مساجد مثل مسجد فارغ بائی (۱۵۰۲ء) مصر کی طرز تعمیر کی اخیر مشہور عمارتیں ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی یعنے سلیم ترک کی فتح کے بعد سے عربی صنعت اس ملک سے اٹھ گئی۔ ان ملک گیروں نے اسے بہت جلد برباد کر دیا اور بالآخر وہ مفقود ہو گئی۔ صنعت اسی وقت تک سرسبز رہتی ہے جب تک اس کی قدر کی جائے اور اس میں ترقی دیجائے لیکن ترکی دماغ میں کسی قسم کی صنعت کا مذاق ہی نہیں۔ وہ عمارت جو ترکوں کے زمانہ میں بنیں نہایت بدہیئت آرائشوں سے لسی ہوئیں اور شوخ رنگوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ایبرس نہایت درست لکھتا ہے کہ "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس قسم کی عمارتیں زیادہ دنوں صناع کی آنکھوں کو نہیں دکھائینگی ان سے غرض یہ نہیں ہے کہ یہ زیادہ دنوں قائم رہیں بلکہ محض یہ غرض ہے کہ جس کام کے لئے

وہ بنائی گئی ہیں اُن سے وہ کام نکلے۔ ترکوں کے اخلاف جن کا مطلق خیال اِن عمارتوں کے بنانے میں نہیں کیا گیا ہے اس بے پروائی کے عوض میں، خود بھی انہیں بالکل بھول جائینگے۔

افریقیائے شمالی کی یادگاریں

عربوں نے جو عمارتیں شمالی افریقیہ اور جزیرۂ صقلیہ میں بنائیں وہ مصر کی عمارت سے بہت کم مشابہ ہیں لیکن برخلاف اس کے ان کو اندلس کی ابتدائی عمارات سے مشابہت کلی ہے۔ ہم افریقیہ کے قصروں کا کچھ ذکر نہیں کر سکتے کیونکہ اس وقت ان میں سے کوئی باقی نہیں ہے لیکن مارمول جس نے مراکش اور فاس کے قصروں کو غرناطہ کی تباہی سے ایک صدی بعد دیکھا ہے اپنے سفرنامہ افریقیہ میں لکھتا ہے کہ " یہ قصر تقریباً ہر چیز میں الحمرا کے مماثل ہیں "

غالباً جو مشابہت افریقیہ اور اندلس کے پرانے قصروں میں تھی وہ اِن ملکوں کی مذہبی عمارات میں بھی ضرور ہوگی۔ اور اس قسم کی جو عمارتیں ہم تک پہنچی ہیں اُن سے اس مشابہت کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔ زیادہ تر یہ مشابہت میناروں میں ہے۔ یہ اکثر مربع ہیں اور ان میں نہ کٹہرے ہیں نہ باہر جانب گگریں بعض دو یا تین منزل کے ہیں اور ان کی اوپر کی منزلیں بہ نسبت نیچے کی منزلوں کے چھوٹی ہوتی جاتی ہیں۔ اپنی مجموعی ہیئت کے لحاظ سے یہ مینار مصر کے میناروں سے بالکل علیحدہ ہیں۔ کل افریقیہ کے مینار۔ قیروان سے لیکر فاس تک جن میں وہ بھی شریک ہیں جو حال میں لیکن پرانے نمونے پر بنے ہیں۔ مثلاً الجزائر۔ طنجہ وغیرہ کی سب اسی طرز کے ہیں۔ اسی طرز کے مینار

اشبیلیہ کے گرالڈا میں اور طلیطلہ کے گرجو نکے برجوں میں جو بالکل عربی وضع کے ہیں پائے جاتے ہیں۔

علاوہ ان خاص قسم کے میناروں کے افریقیہ کی پرانی مساجد میں مثل قیروان کے ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان کے گنبد شرقی وضع کا ورد بے ہوئے ہیں اور مصر و ایران کے گنبدوں سے بالکل علیحدہ ہیں۔ جامع قیروان میں اس قسم کے چار برج ہیں۔

عمارات عرب کے باقیات سے جہانتک ہم خیال کر سکتے ہیں باستثنا مراکش کے شمالی افریقیہ میں ہمیشہ شرقی طرز غالب رہی اور برخلاف مصر اور اندلس کے اخیر تک اسی طرز کی پابند ہوتی رہی

جزیرہ صقلیہ کی یادگاریں

جزیرہ صقلیہ کی مشہور عربی عمارتیں ضیزہ اور قوبع کے دو مشہور قصر ہیں جو بلرم کے قریب واقع ہیں اور جن کی بنا دسویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اتنے پرانے زمانہ کے عربی قصر کہیں نہیں پائے جاتے اور اس وجہ سے یہ نہایت ہی دلچسپ یادگاریں ہیں۔ صقلیہ کے عربوں کے تعلقات افریقیہ سے اس قدر زیادہ تھے کہ غالباً ان میں اور افریقیہ کے قصروں میں بہت مشابہت تھی اور ان کے دیکھنے سے ان کی طرز کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ضیزہ اور قوبع کے قصر نہ فقط قصر تھے بلکہ قلعے بھی تھے۔ یہ گھڑے ہوئے پتھروں سے بنے ہوئے اور سامان جنگ سے آراستہ تھے اور بلا تامل صدیوں کا سامنا کر سکتے تھے۔

قصر ضیزہ جو بلرم سے قریب ہے مستطیل ہے پتھر اور چونے کا عظیم الشان

مکعب نظر آتا ہے۔ اس کی دیواریں دور سے ایک زنجیرہ محرابوں کا معلوم ہوتی ہیں جو کسی قدر نکیلی ہیں اور ان کے اندر دُہرے دُہرے دریچے بنے ہوئے ہیں جن کی دونوں جانب کسی زمانہ میں ستون بھی تھے۔ منڈیر کے حاشیہ پر کسی وقت قرمطی کتبے تھے جن کا کچھ بقیہ رہ گیا ہے۔ میں نے موسیو ژیرو دپران ژی کی تصویر سے اس قصر کے ایک دالان کے نقشہ کو جیسا کہ وہ چالیس برس پہلے تھا نقل کیا ہے۔ اس کی آرائش نہائیت ہی سادہ اور خوبصورت ہے اس میں اندلس کی طرح سے قلمی آرائشیں بھی ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان عربی کاریگروں نے جنہوں نے نارمنوں کے وقت میں اس قصر کی مرمت کی ہے اس کی پرانی طرز کو کہاں تک بدلا ہے۔

ضیزہ کے قصر سے تھوڑے فاصلہ پر قوبع کا قصر واقع ہوا ہے۔ ضیزہ اور قوبع کے قصروں کی ظاہری صورت اور ان کی نکیلی محرابوں کی قطاریں اور ان کی باقاعدہ تعمیر اندلس کے عربی قصروں سے بالکل علیحدہ ہے۔ موسیو دے پران ژی ان کو مصر کی عمارتوں سے مشابہ بتاتے ہیں۔ لیکن میری رائے میں یہ مشابہت مطلق نہیں پائی جاتی۔ بہت تلاش کے بعد میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ مسجد قلاؤن کے بعض حصوں کو کچھ خفیف سی مشابہت ان قصروں سے ہو تو ہو۔

اندلس کی عربی یادگاریں — اس محقق نے جس کا ذکر اوپر ہوا عربوں کی عمارات اندلس کی تین تقسیمیں کی ہیں۔ عمارات طرز شرقی۔ عمارات درمیانی اور عمارات طرز مغربی۔ اگرچہ یہ تقسیم عموماً مسلم ہوگئی ہے لیکن مجھے اس کے

تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ لفظ مغربی یعنے بربری کا استعمال عمارت میں مجھے بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی چیز سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بربریوں نے کبھی بھی کوئی نئی طرز عربی تعمیر میں قائم کی ہو۔ بربری بادشاہوں نے اندلس میں اسی طرح عربوں پر حکومت کی جیسے چرکسی بادشاہوں نے عربوں پر مصر میں حکومت کی۔ لیکن ان میں سے کسی نے عربی صنعت میں کوئی جدید طرز پیدا نہیں کی۔ اور اندلس میں مغربی طرز تعمیر کا وجود ویسا ہی مفقود ہے جیسا مصر میں چرکسی طرز تعمیر کا۔

ہمارے پاس اس زمانہ کی صاف اور صریح اسناد موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین بربریہ کے زمانہ میں عمارتوں کے بنانے والے ہمیشہ عرب ہوتے تھے ہم ذیل میں اس وقت کے ایک مصنف کے قول کو نقل کرتے ہیں۔ ابن سعید لکھتا ہے۔

"امرائے بنی موحدین میں سے یوسف اور یعقوب المنصور نے اندلس ہی سے جو ان کی سلطنت مغربیہ میں شامل ہوگیا تھا عمارت بنانے والے بلائے تھے اور ان ہی سے مراکش اور رباط اور فاس اور منصوریہ کی عمارات ہوائی تھیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آج کے دن (۱۲۲۳ء) مراکش کی وہ سرسبزی اور تزک و احتشام تونس پر منتقل ہوگئی ہے جس کا سلطان عمارتیں اور قصر اور باغات اور تاکستان اندلس کی وضع پر بناتا ہے۔ اس کی عمارات کے صناع معمار۔ نجار۔ اینٹیں بنانے والے۔ رنگنے والے اور باغبان سب اندلس سے آئے ہیں۔ عمارتوں کے نقشے اندلس کی وضع پر تجویز کئے گئے ہیں یا اندلس ہی کی عمارات سے نقل ہوئے ہیں۔"

اندلس کی سب سے قدیم عربی عمارت مسجد قرطبہ ہے یہ اس زمانہ کی عمارت ہے جس کو میں شرقی عرب کہتا ہوں نہ شرقی۔ کیونکہ کوئی شرقی عمارت اس مسجد کی طرز کی نہیں ہے۔ اس کے بہول گئے ستونوں کے پرکالے جن میں ہر قسم کے گل و برگ کھجور کے پتے۔ ایک دوسرے میں ہم آغوش۔ آرائشیں پتھروں کی پچی کاری۔ سنہری زمین پر پھول بوٹے وغیرہ نظر آتے ہیں البتہ طرز شرقی سے اخذ کئے گئے ہیں لیکن کوفی حروف کی تزئین اور نعل اسپی اور قاشدار محرابیں ایک دوسرے پر قائم کی ہوئیں اور مختلف قسم کی گل کاریاں اس میں وہ لطف پیدا کرتی ہیں جو خاص عربی طرز کا لطف ہے اور جن کی وجہ سے یہ عمارت فوراً شرقی عمارات سے متمیز ہو جاتی ہے۔ محرابوں کے نیچے اوپر قائم کرنے نے جس کی ضرورت اس وجہ سے واقع ہوئی کہ عمارت کی بلندی کا اس کی لمبائی کے ساتھ تناسب ہو جائے اس مسجد کے دالانوں میں وہ شان پیدا کر دی ہے جو اس کے قبل کی کسی عمارت میں نہیں پائی جاتی۔ ان تلے اوپر محرابوں کی بلندی کو اعتدال پر لانے کی غرض سے انواع و اقسام کی محرابوں کا استعمال کیا گیا ہے جس سے عربوں کی فطرتی صناعی ظاہر ہوتی ہے۔ اس باریک خیالی کو شرقیوں کی طرف منسوب کرنے کے لئے ضرور ہے کہ ہم اور بھی ایسی عمارتوں کا پتہ دیں جن میں یہ صنعت دکھائی گئی ہے۔

اندلس میں بھی عربوں نے اپنے کو شرقی طرز عمارات کی تقلید سے اسی قدر جلد علیحدہ کر لیا جس قدر انہوں نے مصر میں اپنے کو علیحدہ کر لیا تھا

سنہری زمین پر شرقی آرائیشوں کے عوض میں بہت جلد نسخی اور قلمی آرائشیں قائم ہوگئیں محرابیں نکیلی ہوگئیں اور ان میں نازک گل کاریاں ہونے لگیں۔

بعد مسجد قرطبہ کے اندلس کی قدیم عمارات عرب میں طلیطلہ کی عمارتیں ہیں۔ اس شہر میں نہائیت دلچسپ یادگاریں موجود ہیں۔ مثلاً لبکرہ کا دروازہ جو نویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا اور باب الشمس جس کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی ہے اور مثل ذالک۔ ان کے معائنہ سے بعض مدارج صنعت عرب کے تغیرات کے نہائیت آسانی سے معلوم ہوتے ہیں۔

اندلس کی پرانی مساجد کے مینار منہدم ہوگئے ہیں اور جو مینار باقی رہ گیا ہے وہ اشبیلیہ کے گرالڈا کا مینار ہے جس کا زمانہ بارھویں صدی عیسوی کا ہے۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ یہ مربع شکل کے تھے۔ جیسا کہ میں افریقیہ کی عمارتوں کے بیان میں لکھ چکا ہوں۔ میں یہ نتیجہ طلیطلہ کے گرجوں کے برجوں سے نکالتا ہوں جو اس وقت موجود ہیں اور جو اندلس کے عربی میناروں کی وضع پر تعمیر ہوئے ہیں یہ گرجے جو تعمیری تفصیلات کے لحاظ سے بالکل عربی ہیں ضرور ہے کہ شکل میں بھی ان ہی عمارات کے مماثل ہوں۔ بلکہ ہم یہاں تک بھی کہہ سکتے ہیں کہ اندلس میں ہرگز قاہرہ کے سے مینار نہ تھے ورنہ عیسائی عمارتوں میں ان کی بھی تقلید ضرور کی جاتی۔

جوں جوں عربوں کا قیام اندلس میں زیادہ ہوتا گیا ان کی عمارتوں میں زیادہ حسن اور زیادہ آراستگی آتی گئی اور بہت جلد ان میں سے کل بیرونی اثر زائل ہو گیا۔ شرقی آرائشیں علی الخصوص سنہری زمین پر پچی کاری کا کام بالکل متروک ہو گیا اور اس کی جگہ ایک نئی آرائش قائم ہو گئی۔ دو مشہور یادگاریں یعنے اشبیلیہ کا القصر اور غرناطہ کا الحمرا اندلس کی طرز تعمیر کے زمانۂ عروج کی عمارتیں ہیں

اشبیلیہ کا القصر گیارھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا لیکن بارھویں اور تیرھویں صدی میں اس کی پھر تجدید کی گئی اور اس کے علاوہ چارلس پنجم اور فلپ دوم اور حال کے زمانہ میں بھی اس میں ترمیمات ہوئیں۔ اس کا روکار تیرھویں صدی کا ہے۔ اس قصر میں تیلیوں کا دالان اور بیت السفرا اور بعض حصے نہایت پرانے سمجھے جاتے ہیں۔ القصر کے پرانے حصوں میں الحمرا کی سی آرائشوں کی کثرت اور قلمی گل کاریوں کی گول چھتیں نہیں پائی جاتیں لیکن دونوں عمارتوں کی طرز ایک ہی ہے اگرچہ تفصیلات میں فرق ہے۔ نیچے سے بالکل پھیلی ہوئی محراب جو الحمرا میں تقریباً متروک ہو گئی ہے القصر میں موجود ہے۔ اسی طرح نکیلی محرابیں جو الحمرا میں کم استعمال ہوئی ہیں القصر میں کثرت سے ہیں۔ القصر کی مربع تختہ بندی کی ہیئت رنگین اور سنہری چھتیں قاہرہ اور دمشق کی قدیم قصروں کی چھتوں سے بہت مشابہ ہیں۔

وہ الحمرا ہی کا قصر ہے جس کی تعمیر تیرھویں صدی میں ہوئی تھی جس میں

اندلس کی عربی طرز عمارت کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ آرائش کی اس میں البتہ کثرت ہے لیکن اس کثرت میں ایسا عمدہ مذاق صرف کیا گیا ہے کہ اس عمارت پر ہرگز زمانہ انحطاط کی عمارت کا اطلاق نہیں ہو سکتا اگرچہ الحمرا کی دیواریں گھڑے ہوئے پتھروں کے عوض میں ایک قسم کے مصالح کی بنی ہوئی ہیں جس کے اجزا چونے اور ریتی مٹی اور سنگریزوں سے مرکب ہیں اور اس کی کل آرائشیں محض گچ سے بنائی گئی ہیں تاہم اس عمارت میں نہایت درجے کا استحکام معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس نے بلا کسی تجدید کے پانچ صدیوں کی بے اعتنائیوں کا سامنا کیا ہے۔

الحمرا کی تعمیری خصوصیات جو میری رائے میں اُسے اشبیلیہ کے القصر سے متمیز کرتی ہیں یہ ہیں۔ کل سطحوں پر رنگین گچ کی استرکاری باریک ستون عرض میں مخطط اور ان کے سروں پر ہم آغوش گلکاریاں۔ سادی محرابوں کے دریچے گل بوٹوں سے آراستہ۔ مستطیل چوکٹوں میں جڑے ہوئے چھتوں کے طاق قلمکار آرائیشوں سے لسے ہوئے۔

مصر میں اس وقت کوئی قصر الحمرا کا ہمعصر موجود نہیں ہے لیکن ان قصروں کی آرائش کا اندازہ اگر مسجدوں کی آرائش سے کیا جائے تو قرین قیاس یہ ہے کہ ان میں بہت بڑا فرق ہوگا۔ مصر اور اندلس کی عربی طرزیں بیشک اصولاً ہم اصل ہیں لیکن ان کی ظاہری صورتوں میں جو تغیرات پیدا ہوئے ہیں ان میں باہم بہت کم مشابہت ہے۔

عربوں کی طرز عمارت کا اثر عیسائی عمارتوں پر جو ان کے بعد اندلس میں تعمیر ہوئیں بہت کچھ ہوا۔ ان کے اخراج سے پہلے مسلمان ہی معمار عیسائی عمارتوں کی تعمیر یا ترمیم کیا کرتے تھے۔ ان دونوں طرزوں کے مل جانے سے جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ایک نئی طرز پیدا ہوگئی جس کو مدیار کہتے ہیں۔ ہم اپنی کتاب کے اس باب میں جہاں عربوں کا اثر یورپ پر دکھایا گیا ہے اس طرز کی کئی مثالیں دینگے۔

علاوہ اس طرز کے جس کا اوپر ذکر ہوا اندلس کی قدیم یہودی ہیکلوں میں ایک خاص طرز پائی جاتی ہے جو عربی طرز سے بہت مشابہ ہے اور جس کو یہودی عرب طرز کہہ سکتے ہیں۔ اس طرز میں اور طرز مدیار میں اسی قدر فرق ہے کہ اس کی آرائشوں میں عبرانی حروف اور نباتی پھول بوٹے علی الخصوص بڑے بڑے پتے اختیار کئے گئے ہیں۔ طلیطلہ کی دو پرانی ہیکلیں یعنے ہیکل الترانزیتو اور ہیکل سنٹیا مریا لا بلانکا اس طرز کی عمدہ مثالیں ہیں۔ یہ عمارتیں شرقی طرز کو بہت کچھ یاد دلاتی ہیں۔

ہندوستان کی یادگاریں | ہندوستان کی اسلامی عمارتیں ایک بہت عمدہ مثال اُن بیّن تغیرات کی ہیں جو کسی قوم کی طرز عمارت میں ان اقوام کے خیالات کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں جن کے ساتھ وہ بود و باش کرتے ہیں۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ جس وقت عرب ہندوستان میں پہنچے تو انہوں نے وہاں ایک بہت ہی قدیم اور مستحکم تمدن پایا اور اگرچہ اپنے مذہب اور زبان اور اپنے فنون اور حرفت کے ذریعہ سے عربوں نے وہ تسلط پیدا کیا جو

جو اس وقت تک موجود ہے تاہم اُن کا ملکی تسلط ہمیشہ نہائت ضعف کی حالت میں رہا۔

ہندوستان کی اسلامی یادگاروں کے بیان میں ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ اس قسم کی یادگاریں ایک قوم کے اثر کو کس وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ دروازہ علاء الدین کی سی ابتدائی عمارتوں میں عربی اور ہندی طرز ملی جلی ہیں اور ایرانی اثر بہت کم ہے برخلاف اس کے اس کے بعد کی عمارتوں میں ایرانی اثر ہندی اثر میں ملا ہوا لیکن اسپر غالب ہے اور عربی اثر محض اوپری چیزوں میں رہ گیا ہے مثلاً کتبوں میں، قلمی آرائشوں میں اور بعض محرابوں کی شکلوں میں۔ اکبر کا مقبرہ تاج بی بی کا روضہ۔ شہنشاہ دہلی کا محل وغیرہ ان تینوں طرزوں کی آمیزش کی مثالیں ہیں۔ ان تینوں طرزوں کی آمیزش سے فی الواقع ایک نئی طرز پیدا ہو گئی ہے جس کو ہند کی طرز مغلیہ یا ہندو ایران وعربی طرز کہہ سکتے ہیں۔ یہ نئی طرز زیادہ تر میناروں میں نظر آتی ہے۔ ہندی عمارتوں کے مینار مثل ایرانی میناروں کے مخروطی ہیں لیکن ان پر میناکاری نہیں ہے اور اکثر اوقات یہ مخطط ہوا کرتے ہیں اور ان کی کئی منزلیں ہوتی ہیں۔ ان کی بیرونی آرائش اور ان کی مجموعی ہیئت سے ان میں اور افریقیہ اور اندلس وقاہرہ کے میناروں میں نہائت آسانی سے فرق معلوم ہوتا ہے۔

ایران کی یادگاریں عہد ساسانیہ یعنے زمانہ فتوحات عرب کی یادگاریں اس وقت ایران میں محض کھنڈروں کی حالت میں ہیں اور ابتدائے زمانہ خلافت کی بھی اکثر عمارتوں کا یہی حال ہے۔ اس وجہ سے ایران کی تعمیری تاریخ کا لکھنا اور علے الخصوص

اس اثر کو دریافت کرنا جو ایرانیوں کی طرزوں نے عربوں پر یا عربوں نے اُن پر ڈالا نہایت مشکل ہے۔

ایران کی اکثر بڑی عمارتیں تیرھویں صدی عیسوی یعنے زمانہ شاہ عباس میں تعمیر ہوئیں لیکن جب ان کا پرانے کھنڈروں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بہت ہی پرانی طرز کی تقلید کی گئی ہے۔ یہ عمارتیں تبّیں طور پر عربی عمارتوں سے علیحدہ ہیں اور اگر کوئی مشابہت ہے تو صرف آرائشوں میں۔

موسیو باتی سیر اپنی تاریخ فن تعمیر میں مساجد ایران کی بابت لکھتے ہیں۔ کہ "ان میں اور شام کی مسجدوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں معلوم ہوتا" میں نہیں جانتا کہ ان کا یہ قول کن وجوہات پر مبنی ہے۔ میری نظر میں تو ان عمارات میں باہمی کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ عربوں کی قدیم مساجد شام یعنی مسجد دمشق و بیت المقدس و جرون کا کوئی مقابلہ اصفہان کی مسجدوں سے نہیں ہو سکتا۔ طرز ایران اور طرز عرب بیشک متحد الاصل معلوم ہوتی ہیں جس طرح ایران کی طرز نے عربی طرز پر اثر ڈالا ہے اسی طرح وہ خود بھی متاثر ہوئی ہے لیکن اس کی جدّت اور اس کی علیحدہ طرز ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ ایرانی مساجد میں چند ایسی خصوصیات ہیں جو باسانی متمیز ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر فرق میناروں اور محرابوں اور گنبدوں کی صورت اور بیرونی آرائشوں میں ہے۔

ایران کے مینار پرانے سے پرانے بھی ہمیں اپنے کارخانوں کے دود کشوں کو یاد دلاتے ہیں یہ سب شکل میں مخروطی اور کسی قدر پست ہیں۔ ان کی سطحوں پر میناکاری ہے اور ان میں عموماً سرے پر ایک ہی کٹہرا ہوا کرتا ہے۔ پس یہ شام و افریقیہ و

اندلس کے مربع میناروں سے بالکل الگ ہیں اور مصر کے مینار جن میں کئی کٹہرے ہوا کرتے ہیں اور جن کی ہر منزل کی شکل علیحدہ ہے اور جن پر ہر قسم کا کام منبت کا بنا ہوا ہے کسی طرح بھی ان سے مشابہت نہیں رکھتے۔

خود مساجد ایران کی صورت بھی ایک خاص قسم کی ہے داخل ہونے کے دروازے کے سامنے ہمیشہ ایک بڑا رواق ہوتا ہے جو ہمدان کی سی پرانی مساجد کے کھنڈروں میں نظر آتا ہے۔ یہ رواق قریب قریب اتنا ہی اونچا ہے جتنا مسجد کا روکار اور اس کے اوپر ایک نکیلی محراب ہوتی ہے جس کے دونوں پہلو ایک خاص طرح پر پھیلے ہوئے ہیں کسی عربی مسجد کا روکار اس قسم کا نہیں پایا جاتا۔

ایرانی مساجد کی بیرونی آرائش بھی خاص قسم کی ہے۔ ان کی دیواروں پر مینلہ کار چینی کی تختیاں مختلف گل بوٹوں کی نصب کی ہوئی ہیں۔ یہ آرائش خاص ایرانی ہے اور جب کبھی یہ مسجد حضرت عمرؓ کی سی عربی عمارت میں پائی جاتی ہے تو فوراً کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایرانی صناعوں کا کام ہے۔

خاص ایرانی مساجد کے گنبد شلجم کی صورت ہوتے ہیں۔ فی الواقع نکیلی نعل اسپی محراب یا مسجد قاہرہ کے پست اور نیچے سے مڑے ہوئے گنبدوں کے مبالغہ سے یہ صورت پیدا ہوئی ہے نکیلی محراب کے پھیلاؤ کو بڑھا کر ایرانیوں نے وہ گنبد نکالا ہے جو آج کل بغداد کی مساجد میں بھی نظر آتا ہے۔ اور اسی قسم کے گنبد ہیں جو اکثر روسی کلیسوں میں علی الخصوص ماسکو میں دیکھے جاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ گنبد کی یہ طرز شرقی ہے لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اس کو

شرقی ایرانی کہنا زیادہ تر صحیح ہوگا۔ مثل ترکوں کے روسیوں میں بھی نئی طرز
پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے لیکن اُن میں یہ صلاحیت البتہ ہے کہ
ان مختلف اقوام کی طرزوں میں سے جن کے ساتھ ان کے معاشرتی تعلقات ہیں
کچھ کچھ اخذ کرکے اپنی ضرورتوں کے مطابق کوئی عمارت بنالیں۔

ایران کی بہت قدیم مساجد کے کھنڈروں میں شلجمی گنبد نہیں پائے جاتے
اکثر مساجد سمرقند۔ مشہد۔ سلطانیہ دوراہین وایروان وغیرہ میں جنہوں نے
بلاشبہ قدیم عمارتوں کی تقلید کی ہے گنبد بالکل شرقی طرز کے ہیں یعنی ان میں
نیچے کی جانب مطلق کجی نہیں ہے۔ ایرانی مساجد میں اکثر قلمی آرائش کے
طاق اور عربی خط میں کتبے بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ یہی وہ آرائشیں
ہیں جو انہوں نے مسلمانوں سے اخذ کی ہیں۔

ہماری کتاب کے پڑھنے والے بآسانی معلوم کرسکینگے کہ عربی طرز تعمیر
ہر ایک ملک میں بدلتی رہی ہے اور ان سب مختلف الہیئت عمارتوں کو ایک
ہی تعریف کے تحت میں لانا اسی قدر غیر ممکن ہے جیسا فرانس کی عمارات
رومی اور گاتھک اور عمارات نشأۃ الثانیہ کو فرانسیسی طرز کا بیان کرنا
محال ہے۔

تمام شد

